ڈاکٹر ملک غلام مُرتضیٰ اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبہ ترجمہ

اِسلامک یونیورسٹی مدینہ منوّرہ

کی

تصانیف

- وجودِ باری تعالیٰ اور توحید ۶۰/- روپے
- رسولِ اکرمؐ کی شادیاں اور ان کا پس منظر ۸/- "
- مقصدِ حیات اور اُس کا حصول ۸/- "
- جرائم کے اسباب (ایک نفسیاتی تجزیہ) ۶/- "
- نشہ اور اُس کا حتمی علاج (ایک نفسیاتی جائزہ اور عملی تدابیر) ۶/- "
- حقیقتِ دُعا ۹/- "
- توبہ کی حقیقت ۶/- "
- احیائے دین کی اساس ۸/- "
- اسلام اور محمدؐ پر بہتانات (عربی) (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں جہالت اور بغض پر مبنی ۲۴ الزامات اور غلط بیانیوں کا مدلل جواب) ۲۰/- "
- " " " " (اُردو) ۲۰/- "
- " " " " (انگلش) ۲۰/- "

ملنے کا پتہ

اِدارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ - رحمان مارکیٹ - غزنی سٹریٹ - اُردو بازار لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۷ | اگست ۱۹۸۷ء مطابق ذوالحجہ ۱۴۰۷ھ | عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر: ۴۲۶۳۶ ——— ۴۲۴۴۶۸ ۳

زرسالانہ تیس روپے ۔ فی پرچہ ۳/ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے اپنج فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(۱)

اسلامی عبادات کے تمام انوار افروز اسباق حج جیسی عظیم عبادت کے بھی اسباق ہیں اور کچھ زیادہ زور و اثر کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک کلمے کو محور بنا کر دو چار ضروری باتیں عرض کرتے ہیں۔

"حاضر! اے میرے اللہ! غلام حاضر!" ——— "حاضر!......

گھر سے لے کر جزیرۃ العرب میں واقع خدا کے گھر تک یہ ایک کلمہ بار بار گونجتا رہتا ہے، جسے تلبیہ کہتے ہیں۔ لفظوں کے پردے اٹھا دیجیے، اس روح حقیقت کو دیکھیے جو پروگیا ہے حروف کے پیچھے ہے۔

ہم دنیا میں بہت سی ایسی باتیں کہتے اور سنتے ہیں جن کے صرف لفظ گونجتے ہیں اور ان لفظوں کی دیواروں کے پیچھے جو حقیقتیں چھپی ہوتی ہیں، ان تک ہماری نظر جاتی ہی نہیں۔ اپنے روزمرہ بولے، سننے اور پڑھے لکھے جانے والے لفظوں پر کسی دن غور کیجیے۔ یہی زیادتی خدائی کلام اور خدائی کلمات اور عبادات کے الفاظ کے ساتھ بھی جاری رہتی ہے۔ آیئے عبادتِ حج کے چند کلمات کو ہم ان کے معنی کے لحاظ سے دیکھتے ہیں۔

کیا آپ ہم نے کبھی یوں محسوس بھی کیا کہ "حاضر، غلام حاضر!" کا مطلب کیا ہے۔ مطلب سیدھا سادا ہے کہ اے اللہ صرف آپ ہمارے آقا اور رب و الٰہ ہیں اور ہم صرف آپ کے حکموں میں

جکڑے ہوئے غلام ہیں۔ ہم دُنیا کے چنگل اور مصروفیات کے جنگل سے نکل کر براہ راست آپ کے گھر میں غلامی کے اقرار کے ساتھ پیش ہو گئے ہیں۔ ہمیں حکم فرمایئے ــــ مال، اولاد، سر، سینہ، رگوں کا لہو، عہدہ وجاہ سب کچھ حاضر!

پھر یہ ایک لمحے کے لیے محسوس کر کے بھلا دینے کی بات نہیں، بلکہ بعد کی ساری عمر میں یاد رکھنا ہے کہ وہ مالک ہے اور ہم غلام۔ اس نے جو حکم دیئے ہیں اُن کے سامنے سرِتسلیم خم رہے گا، جو قانون بنا دیئے ہیں وہ آخری معیار و فیصلہ ہوں گے، جو شریعت مقرر کی ہے وہ بسر و چشم قبول رہے گی۔ ہم بندے ہیں، ہم غلام ہیں، ہم پابندِ احکام ہیں۔ کوئی چوں و چرا نہیں، کوئی بحثا بحثی نہیں، نکل بھاگنے کی کوئی کوشش نہیں، حکم کی مشکل کو آسان کرنے کے لیے کوئی ہیر پھیر نہیں۔ ہم ویسے غلام ہیں جیسے حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (میں ڈوبنے اور غائب ہونے اور زوال پانے والوں کو پسند نہیں کرتا) کے نقطۂ آغاز سے چل کر یہ واضح اعلان کیا تھا کہ اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (انعام ۷۹)

مطلب یہ تھا کہ میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اپنا رُخ سیدھا اس ہستی واحد کی طرف کر لیا، جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اور پھر اسے اپنا خدا اور معبود ماننے اور اس کی غلامی اختیار کرنے کے بعد اس کی طرف سے ذرا سا اشارہ ہونے پر بڑھاپے کے عزیز ترین نوعمر بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اسی واقعہ کی یاد کے طور پر آج مکہ میں علامتی طور پر جانوروں کی قربانیاں دی جاتی ہیں۔ اور ان کو پیش کرتے ہوئے گویا جذبہ وہی ہوتا ہے (یا ہونا چاہیے) کہ غلام حاضر ہے اور غلام ہر چیز کو، حتیٰ کہ اپنے بیٹوں کو آپ کے حکم پر قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔

بات اگر صرف بھکشوؤں والی تبلیغ کی ہوتی ہے، جو اہل جاہ، اہلِ منکر اور اہلِ فساد کے رویوں سے تعرض کیے بغیر ایک طرف سے کنی کاٹ کر گذر جاتی ہو، تو پھر ان قربانیوں کی کہانیاں تازہ کرنے اور بار بار نئے عہد لینے کی ضرورت نہ تھی۔

ہمارے حاجی صاحبان، خدا ان کی تعداد بڑھائے۔ کاش کہ یہ مستقل جذبہ حج سے واپسی پر پلے باندھ کے لائیں کہ "حاضر، اے میرے اللہ! ــــ غلام حاضر!" ــــ اور پھر یہ حج کرنے والا غلام

کسی بے دینی اور کسی ضلالت اور کسی منکر اور کسی حرام سے سمجھوتہ نہ کرے۔

اگر ایسا ہو تو دین کی دعوت بھی گلی گلی، گھر گھر پھیل جائے گی اور پوری فضا انقلاب کے لیے بھی جلد تیار ہو جائے گی۔ اس کا اثر دستور اور پارلیمنٹ، سیاست اور تعلیم، ادب اور صحافت، نیز اقتصاد و معیشت پر پڑے گا۔

مگر پہلے اللہ کے کچھ سچے غلام چاہئیں، خواہ وہ تھوڑے ہوں!
حج کا ایک بڑا مقصد خدا کے ایسے سچے غلام پیدا کرنا ہے۔

---

(۲)

آج وہ مہینہ سامنے آجاتا ہے جب کہ عین مرحلۂ آزادی میں مسلمانوں کے لیے ۱۹۴۷ء میں بھرپور طور پر بھارتی بہیمیت کی خونیں فصلِ بہار آئی تھی۔ نہ صرف ہر سال پچھلے زخم تازہ ہو جاتے ہیں اور ناسوروں کے پھول کھل اٹھتے ہیں۔ بلکہ آج جو مسلم کشی کی لہر رمضان اور عید رمضان سے لے کر اب تک چل رہی ہے، اس کے لرزہ خیز واقعات ہر حساس مسلمان کے سینے کو کھرچتے ہیں۔ زندگی کے تمام لطف، قوت و شوکت کے سارے تذکرے، دولت و تعیش کے سارے اسباب منہ بگاڑ بگاڑ کر ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس حال میں ہر خندہ و تبسم ایک جھوٹ معلوم ہوتا ہے۔ اور ہر دعوائے قوت اور نعرۂ اعدا کشی بچوں کا کھیل تماشا لگتا ہے۔ سچ ہے:

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت
مزاجِ تو از حالِ طفلی نگشت

پوری دنیا کی مسلمان ملت پر شاید بے حسی اور بے جمعیتی اور مداہنت کا ایسا دور بر وقت کبھی نہ آیا ہوگا (مجاہدین کی صفوں کے استثناء کے ساتھ)، وہی نقشہ ہے کہ ہماری تعداد بہت ہے مگر ہم پر چاروں طرف سے ظالم اور مفسد قوتیں ٹوٹی پڑ رہی ہیں اور ہمارے پاس تقریروں اور قرار دادوں کے سوا کچھ نہیں۔ یہ وہی حالتِ "وَهْن" ہے جس کا اندیشہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیوں پہلے دلایا تھا۔

اور اب تو ہماری بد اعمالیوں، کوتاہ کاریوں اور نالائقیوں کے نتیجے میں کئی اطراف سے کئی شکلوں میں عذابِ الٰہی کے کوڑے ہم پر برس رہے ہیں۔ اللہ معاف فرما کر ہدایت دے۔ ہم آزادی کی جھلک اُسی دن دیکھ سکیں گے جس دن اسلام یہاں کارفرما ہوگا۔

---

(۳)

حج کی آمد کے ساتھ حج کی قربانیوں کا تصور کرتا ہوں تو بھارت کا یہ منظر بڑا عبرت آفریں بن جاتا ہے کہ میرٹھ اور دہلی میں ایک نئی قربان گاہ کھلی ہے جو مسلسل توسیع پا رہی ہے۔ اور اس قربان گاہ میں بھیڑوں، بکریوں، دُنبوں اور اُونٹوں یا دوسرے چوپایوں کی جگہ مسلمان مرد، عورتیں اور بچے ذبح ہو رہے ہیں اور قصاب نہ صرف انتہائی متعصب، خونخوار، ترشول بردار ہندو جنونی ہیں، بلکہ ان کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کو تحفظ دینے میں پولیس اور فوج دونوں انسانی اقدار سے بالکل خالی ہیں۔ حد یہ ہے کہ زندہ انسانوں کے اعضا کاٹے جاتے ہیں، آگ میں ان کو جلایا جاتا ہے، قطاروں میں کھڑے کر کے گولیاں ماری جاتی ہیں۔ اور پھر بڑے سے بڑے گڑھے کھود کر سینکڑوں لاشوں کو اکٹھے بے غسل و کفن دفن کر دیا جاتا ہے، کوئی تفتیش نہیں، کوئی مقدمہ نہیں، کوئی عدالت نہیں۔
یوں سمجھئے کہ ایک بڑا مقتل ہے جس میں بہیمانہ مزاج کی کئی کئی منظم اور غیر منظم ٹولیاں شریکِ جرم ہیں۔[1]

---

[1] ایک مسلم دشمن ملک کی بہیمانہ حرکات پر آواز بلند کرتے ہوئے یہ حقیقت باعثِ شرم بنتی ہے کہ خود ہمارے ہاں تخریب کاری، تباہ کاری، خونریزی اور تصادم کے خوفناک حادثات پیش آ رہے ہیں۔ ہم لوگ آپس میں صوبائی، لسانی اور نسلی گروہ بندیاں بنا کر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ اور ایسے ایسے مظالم سامنے آ رہے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت رخصت ہو گئی ہے اور محض ایک حیوان باقی رہ گیا ہے۔ آپ ہزار دشمنوں اور جاسوسوں اور کسی خفیہ ہاتھ کو حالات کا ذمہ دار ٹھہرائیں، مگر حکومت سے لے کر عوام تک ہم سب ذمہ دار ہیں اور اس ذمہ داری کا بوجھ ہم اُتار کے پھینک نہیں سکتے۔

اور حکومت، قانون، عدالتوں، پولیس، فوج، صحافت اور ادیبوں میں سے اتنے بڑے ظلم اور جرم کو ظلم اور جرم کہنے والا تک کوئی نہیں ــــــ روک تھام کرنے کا کیا سوال ـــ مسلم دشمنی کا جو جنون منو مہاراج، چانکیہ جی اور سردار پٹیل بھارتی قوم کو دے گئے ہیں، اس کے آگے تو راجیو گاندھی صاحب بھی نہیں کھڑے ہو سکتے۔ کھڑے کیا، وہ دو لفظ بھی مسلمانوں کی مظلومیت پر نہیں بول سکتے۔ ایک تباہی زدہ علاقے میں گئے تو ہندو کا گھر دیکھا کہ اسے کتنا نقصان پہنچا۔ کسی مسلمان کے نہ گھر جا سکے، نہ ان کی یک طرفہ تباہی پر بات کر سکے۔ نہ ان کی لاشوں اور ان کے زخمیوں کے چمن زاروں کی سیر کر سکے۔ جہاں وہ آگ سے جلے چہرے، زخموں اور خون کے دھبوں کے پھول کھلے ہوئے دیکھتے۔ اس سلسلے میں حقائق کا بیان دشوار ہے۔ ہم اتنا ہی کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی نسل کشی اور معاشی تباہی کا یک طرفہ کھیل برسوں سے ملک کے مختلف حصوں میں جاری ہے۔ ایک فرسودہ اور انسانیت دشمن فریب پر کھڑی وطنی قومیت کی رُوحِ بد اسے نہایت وحشیانہ انداز سے بڑھا رہی ہے۔

اس موقع پر کچھ فرائض ساری انسانیت کے ہیں۔ لیکن سب سے پہلے مسلمان قوموں اور ملکوں کا دائرہ آتا ہے جو قریب تر ہے۔ کیا وہ حسبِ ذیل نکات پر غور کریں گے۔

۱۔ تمام دوستیاں اور معاہدے اس وقت تک کے لیے معطل کر دیئے جائیں۔ جب تک بھارت کے مسلمانوں کو باعزت زندگی و ترقی اور دین و تہذیب کے تحفظ کی ضمانت نہیں مل جاتی۔

۲ ـــ بھارت کے تمام ٹھیکوں اور سودوں کو منسوخ کر دیا جائے اور اس سے تجارتی لین دین بھی روک دیا جائے۔

۳ ـــ بحری بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں کو استعمال کرنے کے معاہدات منسوخ کر دیئے جائیں۔

۴ ـــ بھارت میں مسلمانوں کی جو نسل کشی ہو رہی ہے اس پر یو این او میں متفقہ احتجاج کرنے کے بعد سارا معاملہ بین الاقوامی عدالت کے سامنے لایا جا سکے۔

۵ ـــ تازہ مسلم کش ہنگامے کی جامع رپورٹ رابطہ یا موتمر مرتب کرائے اور ایک رپورٹ ۱۹۴۷ء سے اب تک کے مسلم کش بلووں کی تیار ہونی چاہیے۔

۶ ـــ بڑی بڑی چند مسلم سلطنتوں کی طرف سے بھارت سے فوری طور پر حسب ذیل امور کا مطالبہ

کیا جائے:

ا۔ رابطہ مؤتمر عالم اسلامی اور اسلامی کانفرنس کی طرف سے ایک ایک وفد کو صورتِ حالات کا مطالعہ کرنے اور ہندو مسلم سب سے مل کر تفصیلات جمع کرنے کا موقع دیا جائے۔

ب۔ مجلس ہلالِ احمر کو موقع دیا جائے کہ وہ مصیبت زدہ لوگوں تک تھوڑی بہت مدد پہنچا سکیں۔

ج۔ بھارت اس بات کی قانونی ضمانت دے کہ ہر مرنے والے، ہر زخمی (مختلف مدارج)، ہر تباہ شدہ مکان یا دکان کا معقول معاوضہ دیا جائے، اور ضروری شرحیں طے کرنے کے لیے مختلف صوبوں کے ججوں کا ایک کمیشن بیٹھے۔

د۔ مسلمانوں پر جن لوگوں نے حملے کیے ہوں ان پر بہ حیثیت فرد یا بہ حیثیت جماعت مقدمے چلائے جائیں، اسی طرح جن سرکاری افسروں یا ملازموں کے متعلق جانب داری کے شواہد ملیں، ان کو معطل کر کے ان پر مقدمات چلائے جائیں۔

کام کرنے کا یہ وہ کم سے کم خاکہ ہے جسے مسلمان قوتیں بھارتی مسلمانوں کی مظلومیت کے زخموں پر مرہم رکھنے کا ذریعہ بنا سکتی ہیں۔

کچھ کرنا ہو تو کرنے کی یہ کم سے کم حد ہے، لیکن اگر حمیت تیمور کے گھرانے سے بالکل ہی رخصت ہو گئی ہو تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن۔ آج اگر موجِ خون بھارتی مسلمانوں کے سر پر سے گزر رہی ہے تو کل کسی دوسرے ملک والوں کے سر سے گزرے گی۔ اور پرسوں ہماری کسی تیسری قوم کو نمونۂ عبرت بننا ہوگا۔ خدا سب کو بچائے ___ اور ہر کسی کے اپنے بچنے کی راہ یہی ہے کہ دوسرے کی مظلومی کی پکار پر سب لوگ اٹھیں اور لپکیں اور جو کچھ حمایت ہو سکتی ہو کریں۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ آزمائش یا گرفت کے ان خوفناک لمحوں سے برصغیر کے مسلمانوں کو اور تمام عالمِ اسلام کی ملتِ محمدیہ کو بچا نکالے اور صراطِ مستقیم پر تمام مسلمانوں کو گامزن کر کے فلاح و سعادت کا مقام حاصل کرنے کی توفیق دے۔

جسٹس تنزیل الرحمٰن کے چند اہم فیصلے

- ملک کی اعلیٰ عدالتیں منافیِ اسلام قوانین کو منسوخ کرنے کی مجاز ہیں۔
- سُود حرام ہے، عدالتیں اس کی ادائیگی کے لیے ڈگری جاری نہیں کر سکتیں۔
- دستور، قراردادِ مقاصد اور غیر شرعی قوانین و احکام کے متعلق بحثیں۔

مقدمہ (۱)
مبارکہ پراچہ بنام بنک آف اومان کیس
مقدمہ (۲)
ارشاد احمد خاں بنام مسز پروین اعجاز
مقدمہ (۳)
حبیب بنک بنام محمد حسین

اِن مقدمات کی صرف وہ ترجمہ شدہ تلخیصی رپورٹیں دی جا رہی ہیں، جنہیں جناب ضیاء الاسلام انصاری نے تیار کیا اور مشرق کے ۱۲ جولائی اور ۱۸ جولائی کے پرچوں میں شائع کیا۔

ہم موصوف اور اوراقِ مشرق کے شکر گذار ہیں۔ ترجمان القرآن اگست ۱۹۸۶ء پورا کتابت ہو چکا تھا اور پریس میں جانے والا تھا کہ ہم نے ان اہم مقدمات کی تلخیصی رپورٹوں کے لیے جگہ نکالی۔ ورنہ حق تو یہ تھا کہ پورا رسالہ فیصلوں پر مشتمل ہوتا۔

(ف۔ ص)

مقدمہ نمبر ا

سندھ ہائی کورٹ نے قرار دیا ہے کہ ملک کی تمام اعلیٰ عدالتیں اسلام کے منافی قوانین کو منسوخ کرنے کی مجاز ہیں۔ کیونکہ قرارداد مقاصد کو آئین کا حصہ قرار دینے کے بعد ان عدالتوں کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ سندھ ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن نے یہ تاریخی رولنگ کراچی کی ایک فرم ایسٹ ٹریڈنگ کمپنی کے خلاف بنک اومان لمٹیڈ کے دعوے کے سلسلے میں ایک خاتون مسز مبارکہ پراچہ کی درخواست پر دی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ آئینِ پاکستان کی دفعہ ۲ اے کے تحت قرارداد مقاصد کو آئین کا حصہ بنانے اور قابلِ نفاذ قرار دینے کے بعد اعلیٰ عدالتوں کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ وہ کسی بھی قانون کو جو قرآن اور سنتِ نبویؐ کے منافی ہو، منسوخ کر دیں یا کالعدم قرار دے دیں۔ فاضل جج نے قرار دیا ہے کہ قرارداد مقاصد پاکستان کے قوانین کو اسلامی بنانے کے معاملہ میں قوانین کی اسلامی نوعیت کو جانچنے کے لیے آئینی کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی قرار دیا ہے کہ ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ کی دفعہ ۵۸ (الف) قرآن و سنت کے منافی ہے۔ فاضل جسٹس تنزیل الرحمٰن نے اس مقدمہ میں فریقین کے وکلا کے علاوہ ممتاز قانون دان مسٹر خالد اسحاق اور پاکستان کے اٹارنی جنرل مسٹر علی احمد فضیل کو بھی عدالتی مشیر کے طور پر طلب کیا اور ان کے دلائل سُنے۔

* فاضل جج مسٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن نے ۱۰۲ صفحات پر مشتمل اپنے فیصلے میں مختلف اعلیٰ عدالتوں

بشمول وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلوں سے استفادہ کرتے ہوئے اور ان فیصلوں کے حوالے دیتے ہوئے یہ قرار دیا کہ قرار دادِ مقاصد کو آئین کا قابلِ نفاذ حصہ قرار دیئے جانے کی وجہ سے پاکستان میں نافذ قوانین کو شریعتِ اسلامی یعنی قرآن و سنت کے منافی ہونے کی بنا پر کالعدم قرار دینے کے معاملے میں اعلیٰ عدالتوں کے اختیار کی بابت ایک نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے ۔ ۱۹ ر دسمبر ۱۹۸۵ء تک قرار دادِ مقاصد آئین میں تمہید کے طور پر درج تھی جب کہ ۳۰ ر دسمبر ۱۹۸۵ء سے اسے آئین کے آرٹیکل ۲ اے کے تحت آئین کا قابلِ نفاذ حصہ بنا دیا گیا ہے ۔ فاضل جج نے اس تبدیلی کے بعد قرار دادِ مقاصد کو قوانین کے شریعت کے مطابق یا قرآن و سنت کے منافی ہونے کا جائزہ لینے کے بارے میں کسوٹی قرار دیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اعلیٰ عدالتیں آئین کی پابند ہیں۔ اور کوئی بھی قانون جو آئین کے منافی ہو ناجائز ، بے اثر اور لائقِ تنسیخ ہے ۔ قرار دادِ مقاصد کے اصول اور دفعات آئین کی دفعہ ۲ اے کے تحت اب آئین کا حصہ اور عدالتوں کے ذریعے قابلِ نفاذ ہیں لہٰذا کوئی قانون اور خود آئین کا کوئی حصہ اگر قرار دادِ مقاصد کے منافی ہو تو اعلیٰ عدالتیں اسے بھی ناجائز اور منسوخ قرار دے سکتی ہیں ۔ تاہم یہ اختیار آئین کی دفعات ۲۰۳ اے، بی، ۲۰۳ ڈی اور ۲۰۳ جی کے تابع ہے ، جن کے تحت وفاقی شرعی عدالت کو یہ خصوصی دائرۂ اختیار تفویض کیا گیا ہے کہ وہ دفعہ ۲۰۳ بی (سی)، ۲۰۳ جی کے مفہوم کے مطابق کسی قانون کو اسلامی اصولوں یعنی قرآن کریم اور سنتِ رسولؐ کے منافی قرار دے ۔

فاضل جج نے اس ضمن میں اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ میرے سامنے جو مسئلہ زیرِ بحث ہے وہ ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ ۱۸۸۲ء کی دفعہ ۵۸ ۔ الیف کے تحت رہن کے ایک معاہدے سے تعلق رکھتا ہے جس کا جائزہ قرار دادِ مقاصد کے اصولوں کی روشنی میں لینا ضروری ہے ۔ فاضل جج نے وفاقی شرعی عدالت کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا ہے جس میں وفاقی شرعی عدالت یہ قرار دے چکی ہے ۔ کہ اس قانون میں ماسوائے ان دفعات کے جن کا تعلق سود کے معاملے سے ہے ، کوئی اور دفعہ قرآن و سنت کے منافی نہیں ۔ لہٰذا میں اس فیصلے کا پابند ہوں ۔ تاہم رہن کے معاملات میں جن پر و اسلامی نقطۂ نظر سے ، اس فیصلے کے دوسرے حصے میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے ، میں اس کے برعکس نتیجے پر پہنچا ہوں اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ ۱۸۸۲ء کی

دفعہ ۴۸ الف قرآن وسنت کے احکام کے منافی ہے۔ فاضل وفاقی شرعی عدالت اگر چاہے تو اسے اس بارے میں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی ضرورت کا جائزہ لینا چاہیے۔

فاضل جج نے اپنے اس تاریخی فیصلے کے آخری پیراگراف میں لکھا ہے کہ درخواست زیر بحث کی سماعت کے دوران آخری مرحلے پر یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ بنکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈی نینس ۱۹۷۹ء بھی غیر اسلامی ہے اور اس عدالت کو چاہیے کہ اس قانون کو منسوخ اور کالعدم قرار دے۔ مسٹر خالد ایم اسحاق ایڈووکیٹ اور مسٹر محمد علی سید ایڈووکیٹ نے اس موضوع پر جو دلائل پیش کیے ہیں ان میں خاصا وزن ہے لیکن اس معاملے کا جائزہ مقدمے کی باقاعدہ سماعت کے دوران لینا مناسب ہوگا۔ اس وقت میں صرف سی پی سی کے آرڈر ۳۷ رولز ۳ کے تحت درخواست پر فیصلہ دے رہا ہوں۔

فاضل جج نے اس درخواست کی سماعت کے دوران مدعی بنک آف اومان کے وکیل مسٹر حبیب الرحمٰن بار ایٹ لا، درخواست دہندہ مسز مبارک پراچہ کے وکیل مسٹر محمد علی سید ایڈووکیٹ کے دلائل سننے کے علاوہ عدالت کے مشیر کے طور پر آئینی امور اور قانون کے ممتاز ماہر مسٹر خالد ایم اسحاق ایڈووکیٹ اور اٹارنی جنرل آف پاکستان مسٹر علی احمد فضیل کو بھی دلائل پیش کرنے کی دعوت دی تھی۔ ان فاضل وکلاء کے دلائل اور اس دوران اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کے حوالہ جات اور اسلامی قوانین اور فقہ کے اصولوں کے بارے میں ائمہ کرام، فقہا، مفسرینِ قرآن کی مستند تصانیف سے مفصل اور طویل حوالہ جات فاضل جج نے اپنے فیصلے میں نقل کیے ہیں۔ ان کے ساتھ قرآن کریم کی متعلقہ آیات اور احادیثِ نبویؐ کے حوالوں سے فاضل جج نے اس امر پر فیصلہ کن بحث کی ہے کہ اسلام لین دین بالخصوص قرضے کے معاملے میں املاک یا جائیداد کو رہن رکھنے کی اجازت کن حالات میں اور کن شرائط کے تحت دیتا ہے۔ اور ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ کے تحت رہن کی کیا نوعیت اور شرائط ہیں۔ اور زیر بحث مقدمے میں معاہدہ رہن کی کیا صورت ہے۔

فاضل جج نے اس سلسلے میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلام میں رہن کی اجازت رہن رکھی جانے والی املاک کا قبضہ مرتہن کو دیئے جانے سے مشروط ہے۔ یعنی اسلام رہن بلا قبضہ کی اجازت نہیں دیتا جب کہ مقدمہ سماعت میں جائیداد کی بجائے اس کے کاغذاتِ ملکیت مرتہن کے حوالے کیے

گئے ہیں اور اسی ضمن میں فاضل جج نے ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ کی دفعہ ۵۰ الف کے قرآن و سنت کے منافی ہونے کے مسئلے کا جائزہ لیا ہے۔

فاضل جج نے اپنے فیصلے میں پاکستان کی آئین سازی کی تاریخ کا ایک تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ اور اس بات کو واضح کیا ہے کہ آئینِ پاکستان میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا جو اقرار کیا گیا ہے اور اس کے تحت یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی زندگی قرآنِ حکیم اور سنّتِ نبویؐ کی روشنی میں اسلامی اُصولوں کے مطابق بسر کرنے کے قابل بنایا جائے گا۔ اس عہد کے مطابق جو قرار داد مقاصد کی شکل میں مجلسِ دستور ساز نے مارچ ۱۹۴۹ء میں منظور کی تھی۔ یہ قرار دیا گیا کہ مملکتِ پاکستان اپنے اختیار و اقتدار کو جو اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ کے تحت اسے تفویض ہوئے ہیں عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔ اسی قرار داد میں ماسوائے دوسرے اُصولوں کے، یہ بات بھی شامل ہے کہ عدلیہ مکمل طور پر آزاد ہوگی۔ فاضل جج نے لکھا ہے کہ قرار داد مقاصد کی منظوری تاریخِ پاکستان میں ایک سنگِ میل اور زریں باب کے آغاز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے پاکستان کی نظریاتی بنیاد رکھی گئی۔ اس قرار داد کی روشنی میں مارچ ۱۹۵۶ء کے آئین کے باب ایک پیراگراف ۱۲ کے تحت دفعہ ۱۹۸ (۱) میں یہ درج کیا گیا ہے کہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جاسکے گا جو قرآن و سنت کے متعین کردہ اسلامی اُصولوں کے منافی ہو۔ اور تمام موجودہ قوانین کو اسلامی اُصولوں کے مطابق ڈھالا جائے گا۔

فاضل جج نے بعد میں ہونے والی تبدیلیوں اور آئینی اقدامات کا جائزہ لیتے ہوئے ان تمام فیصلوں اور اقدامات کا ذکر کیا ہے جو قوانین کو اسلام کے مطابق بنانے کے سلسلے میں مختلف حکومتوں کے دور میں کیے جاتے رہے۔ ان میں اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کا قیام بھی شامل ہے۔

فاضل جج نے اپنے فیصلے کے پیراگراف ۳۵ میں صدر ضیاالحق کے صدارتی حکم نمبر ۱۴ کا حوالہ دیا ہے، جس کے ذریعے ہیں ایک نئی دفعہ ۲ الف کا اضافہ (۲ مارچ ۱۹۸۵ء سے اطلاق) کیا گیا۔ اس دفعہ میں کہا گیا ہے کہ قرار داد مقاصد کے اُصول اور اس کی دفعات کو جیسا کہ ضمیمے میں درج کی گئی ہیں آئین کا بنیادی حصہ بنایا جارہا ہے اور اسی کے مطابق ان کا اثر اور نفاذ ہوگا۔ بعد ازاں فاضل جج نے آئین کی ان دفعات کا جائزہ لیا ہے جن کا تعلق قوانین کو اسلام کے منافی قرار دینے اور اسلام کے منافی قوانین کو کالعدم اور منسوخ کرنے کے طریقۂ کار سے ہے۔ ان دفعات

اور طریقہ کار کے تحت وفاقی شرعی عدالت کے خصوصی اختیارات کا ذکر کرتے ہوئے ان حدود و قیود کو بیان کیا ہے جو وفاقی شرعی عدالت کے لیے بعض قوانین کو غیر اسلامی یا قرآن و سنت کے منافی قرار دینے کی راہ میں حائل ہیں۔ اس میں آئین کی دفعہ ۲۰۳ ڈی بھی شامل ہے۔ جو وفاقی شرعی عدالت کو خصوصی دائرہ اختیار عطا کرتے ہوئے یہ واضح کرتی ہے کہ وفاقی شرعی عدالت آئینِ پاکستان مسلم پرسنل لا اور آئین کی دفعہ ۳۔ اے کے نفاذ کے دس سال کے عرصے تک کسی مالیاتی قانون اور ٹیکس اور محصولات عاید اور وصول کرنے سے متعلق قانون اور بنکنگ اور انشورنس سے متعلق قانون اور مروجہ طریقہ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکے گی۔

فاضل جج نے لکھا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت ان پابندیوں کے باوصف اگر کسی قانون کو قرآن و سنّت کے منافی قرار دے دے تو اس کے فیصلے کی تاریخ سے وہ قانون منسوخ، کالعدم یا غیر موثر ہو جائے گا۔ لیکن شرعی عدالت آئین کے تحت ایسے قانون یا اس کے کسی غیر اسلامی حصے کی جگہ متبادل قانون بنانے کی مجاز یا مکلف نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مسلمہ آئینی اور جمہوری اصولوں کے مطابق قانون سازی کرنا عدالتوں کا کام ہے بھی نہیں۔ شرعی عدالت کی اس پوزیشن کی مثال یوں ہے کہ فرض کیجیے کہ عدالت تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ کو قرآن و سنّت کے منافی قرار دے دے اور فیصلہ کر دے کہ قتل کا جرم اسلامی اصولوں کے مطابق قابل صلح نامہ ہے۔ اس لیے یہ دفعہ قرآن و سنت کے منافی ہے تو عدالت اس فیصلے کے بعد قصاص اور دیت کا اسلامی قانون وضع یا جاری یا نافذ نہیں کر سکتی۔

فاضل جج نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ یہ اسکیم اس وقت بھی تھی۔ جب قرارداد مقاصد کو آئین میں تمہید کی حیثیت حاصل تھی اور اب دفعہ ۲ اے کے تحت اسے آئین کا قابلِ نفاذ حصہ قرار دے دیا گیا ہے۔ تب بھی آئین کی متعدد دفعات کی روشنی میں یہی صورتِ حال موجود نظر آتی ہے۔ فاضل جج نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ قوانین کو غیر اسلامی قرار دے کر منسوخ کرنے اور ان کی جگہ اسلام کے مطابق قانون وضع یا نافذ کرنے کے معاملے میں جو خلا نظر آتا ہے، کیا عدالتیں اسے پورا کر سکتی ہیں یا اعلیٰ عدالتیں کسی ایسی آئینی دفعہ کو جو خود قرارداد مقاصد کے منافی ہے یا اس کے نفاذ کی راہ میں حائل ہے، خلاف یا ناجائز اور منسوخ قرار دے سکتی ہیں۔ فاضل جج نے لکھا ہے کہ جہاں تک میری عدالت کا تعلق ہے نہ تو یہ سوال میرے سامنے اٹھایا گیا ہے اور نہ ہی میرے خیال میں مجھے اس پر فیصلہ دینے

کی کوئی ضرورت ہے۔ فی الحال میں ہائی کورٹ کی اوریجنل سائیڈ پر ایک دعویٰ کی سماعت کر رہا ہوں جس کا تعلق بنکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈی ننس ۱۹۷۹ء کے بارے میں عدالت کے دائرہ اختیار سے ہے۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر دستور سازوں نے قرارداد مقاصد پر عمل درآمد کے سلسلے میں آئینی خلا کو پُر کرنے کا کوئی طریقہ تجویز نہیں کیا تو کیا عدالتیں اس خلا کو پُر کر سکتی ہیں۔ میرے خیال میں ایسا کرنا عدالتوں کی طرف سے آئین کی تشریح کے پردے میں قانون سازی کے اختیارات کے ناجائز استعمال کے مترادف ہوگا۔

فاضل جج نے مقدمہ حاجی نظام خان بنام ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج میں لاہور ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس محمد افضل ظلّہ (اب سپریم کورٹ کے جج) کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا ہے جس میں قرار دیا گیا ہے کہ موجودہ آئینی نظام کے تحت ہمارا آئین عدالتوں سے بعض شعبوں میں اسلامی اصولوں کے نفاذ کا تقاضا کرتا ہے۔ اور بعض شعبوں میں ان کے استعمال اور اختیار کو محدود کرتا ہے۔ آئین کے تحت یہ بات کہ تمام قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق بنایا جائے گا اور یہ کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے منافی نہ بنایا جائے آئین کے دفعہ ۲۲۷ II کے تحت ہی روبہ عمل لائی جا سکتی ہے جس کے لیے اسلامی نظریے کی کونسل قائم کی گئی ہے۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ عدالتوں سے مطالبہ کرے کہ وہ قوانین کو اسلام کے مطابق بنائیں اس لیے کہ انہیں ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ موجودہ قوانین جیسے کچھ بھی ہیں ان کو نافذ کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر ضابطہ تعزیرات پاکستان میں غیر اسلامی دفعات موجود ہیں۔ لیکن عدالتیں محض اس بنا پر ان کو نافذ کرنے یا ان پر عمل کرنے سے انکار نہیں کر سکتیں کہ یہ دفعات اسلامی اصولوں کے منافی ہیں۔

فاضل جسٹس تنزیل الرحمن نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ آئین کی دفعہ ۲۲۸ (۶) کی قانونی پوزیشن جیسا کہ مسٹر جسٹس ظلّہ کے مندرجہ بالا فیصلے میں بیان کی گئی ہے۔ اب تبدیل ہو چکی ہے۔ آئین کی دفعہ ۲ اے کے ذریعہ قرارداد مقاصد کو آئین کا حصہ بنا دینے سے اعلیٰ عدالتیں نہ صرف اس بات کی مجاز ہو گئی ہیں۔ بلکہ اُن پر یہ فرض عائد ہو گیا ہے کہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں جیسا کہ آئین تقاضا کرتا ہے، موجودہ قوانین کے قرآن وسنت کے منافی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کریں ماسوائے اس کے کہ کوئی قانون خصوصی طور پر وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار میں آتا ہو۔ فاضل جج نے مزید لکھا

ہے کہ اس معاملے میں مسٹر خالد اسحاق ایڈووکیٹ اور مسٹر محمد علی سید ایڈووکیٹ نے یہ واضح کیا کہ وفاقی شرعی عدالت اگر کسی قانون کو قرآن اور سنت کے منافی قرار بھی دے دے تو وہ اس قانون کے نفاذ سے متاثر اور عدالت میں آنے والے فریق کو کوئی سہولت، رعایت یا فیض نہیں پہنچا سکتی۔

فاضل جج نے اس مسئلہ پر وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس گل محمد کے ایک مقالے سے طویل اقتباسات پیش کئے ہیں، جو انہوں نے پانچویں جیورسٹ کانفرنس مارچ ۱۹۸۶ء منعقدہ کراچی میں پڑھا تھا۔ اس مقالے کے متعلقہ حصوں اور دیگر اعلیٰ عدالتوں کے چند فیصلوں کا حوالہ دیتے ہوئے فاضل جج نے مسٹر جسٹس گل محمد کے مقالے کے اس حصے پر بحث کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دفعہ ۲ اے کے تحت قرارداد مقاصد کو قابل نفاذ قرار دینے کا منطقی نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ عدالتیں اس کے تحت انصاف طلب کرنے والوں کو انصاف بھی دے سکیں، جبکہ وفاقی شرعی عدالت بعض صورتوں میں جن کا پہلے ذکر آ چکا ہے ایسا اختیار نہیں رکھتی۔ (آئینی قوانین، مالیاتی امور، سود، بنکنگ اور انشورنس سے متعلق قوانین وغیرہ وغیرہ)

جسٹس گل محمد کا کہنا ہے کہ اگر اللہ کی حاکمیت کو نافذ ہونا ہے جیسا کہ قرارداد مقاصد اور آرٹیکل ۲ اے کا تقاضا ہے تو ان سے مستثنیٰ قوانین کے معاملے میں بھی عدالتوں سے رجوع کرنے والوں کو فیصلہ اور انصاف ملنا چاہیے۔ آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت اعلیٰ عدالتیں اس بات کی مجاز ہیں کہ کسی درخواست دہندہ یا فریق متاثرہ کی درخواست پر کسی سرکاری افسر یا حاکم کو کوئی ایسا کام کرنے سے باز رہنے کا حکم جاری کریں، جو قانون کے مطابق اُسے نہیں کرنا چاہیے۔ یا کسی ایسے فعل یا اقدام کے خلاف جو قانون کے منافی ہو، درخواست دہندہ کو فوری یا عارضی تحفظ، سہولت یا مفاد فراہم کریں، منطقی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی مجلسِ قانون ساز کا بنایا ہوا کوئی قانون اللہ کی حاکمیت کے تصور یعنی قرآن و سنت کے احکام کے منافی ہو تو اُس کو ناجائز اور غیر قانونی قرار دے دیا جائے، جب کہ وفاقی شرعی عدالت صرف ایک محدود دائرے میں یہ کام کر سکتی ہے اور کسی کو رعایت بھی نہیں دے سکتی، جب کہ اس کے برعکس ہائی کورٹوں کے دائرہ اختیار میں ماسوائے مسلح افواج کے ایسا کوئی استثنا نہیں ہے اور وہ عدالت سے رجوع کرنے والے کو رعایت، سہولت یا مفاد بھی دے سکتی ہیں۔ اس لیے موجودہ صورت میں اعلیٰ عدالتیں نہ صرف کسی قانون کو غیر اسلامی قرار دینے کی مجاز ہیں، بلکہ عارضی یا مستقل ریلیف بھی دے سکتی ہیں۔

دریں حالات وفاقی شرعی عدالت کے ذریعے فیصلوں کے نظام کو ناکافی سمجھتے ہوئے لوگوں کو یہ حق دیا جانا چاہیے کہ وہ شریعت پٹیشن جیسے معاملات کو بھی عام رٹ پٹیشن کی شکل میں ہائی کورٹ کے سامنے لے جا سکیں۔

فاضل جج نے مزید لکھا ہے کہ اٹارنی جنرل نے اس بحث میں سندھ ہائی کورٹ کے فل بنچ کے ایک فیصلہ کا حوالہ دیا ہے جو محمد یحییٰ میمن بنام گورنمنٹ آف سندھ مقدمہ میں دیا گیا ہے۔ میں نے رجسٹرار کے دفتر سے اس فیصلہ کی نقل منگوا کر اس کا مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فاضل اٹارنی جنرل معاملہ کو مؤثر طور پر سامنے نہیں لا سکے۔ بہرحال مطلب یہ تھا کہ آئین کی دفعات کو قرارداد مقاصد کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جا سکتا۔ اس فیصلہ میں جس کا اصل فیصلہ فاضل جسٹس محمد ظہورالحق نے لکھا ہے اور اس سے جسٹس چودھری عبدالقدیر نے اتفاق کیا ہے۔ لیکن اس فیصلہ میں دفعہ ۲ اے کا کوئی ذکر نہیں ہے، البتہ فاضل چیف جسٹس اور مسٹر جسٹس علی مدد شاہ اور جسٹس حیدر علی پیرزادہ کے فیصلہ میں دفعہ ۲ اے کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن یہ ذکر دوسرے پس منظر میں آیا ہے۔ یعنی یہ کہ آئین کی ایک دفعہ (۲۷۰ اے) میں ترمیم کو ایک اور دفعہ ۲ اے کے ذریعے نہیں پرکھا جا سکتا۔ لیکن یہ مسئلہ میرے سامنے زیر بحث مسئلہ کے متعلق نہیں ہے۔

فاضل جج نے اس بحث اور تنقیحات کی روشنی میں درخواست زیر بحث پر یہ فیصلہ دیا کہ درخواست دہندہ مسز مبارکہ پراچہ کے بنگلہ کو جس کی مالیت سات لاکھ روپے دستاویزات بنک آف اومان کے سپرد کرتے کے وقت تھی، ستر لاکھ روپے کے قرضہ کی ضمانتوں میں سے خارج کر دیا۔ جیسا کہ وہ اپنے فیصلہ میں ثابت کر چکے ہیں کہ اسلام رہن بلا قبضہ کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اس قرضہ سے متعلق ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ کی دفعہ ۵۸ ایف کو بھی انہوں نے قرآن و سنت کے منافی قرار دے۔

مقدمہ ۲، ۳

سندھ ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن نے جو قبل ازیں بنک آف اومان بنام ایسٹ ٹریڈنگ کمپنی کے مقدمہ میں مسز مبارکہ پراچہ کی درخواست پر یہ تاریخی فیصلہ دے چکے ہیں کہ اعلیٰ عدالتیں آئین کی دفعہ ۲ اے اور قرارداد مقاصد کے تحت قرآن و سنت کے منافی کسی بھی قانون کو کالعدم اور منسوخ قرار دے سکتی ہیں

اب دو الگ الگ مقدمات کے فیصلوں میں قرآن کی رو سے سود کے حرام ہونے کی بنا پر قابلِ بیع دستاویزات یعنی پرومزری نوٹ بل آف ایکسچینج وغیرہ سے متعلق قانون نیگوشی ایبل انسٹرومنٹ ایکٹ ۱۸۸۱ء کی دفعات ۸۰، ۷۹ اور ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۳۴ ۔ آرڈر نمبر ۳۷ کی دفعہ ۲ کو قرآن وسنت کے منافی قرار دیتے ہوئے کالعدم کر دیا ہے۔ ان دفعات کی رو سے عدالتیں قرضوں پر سود کی ادائیگی اور سود کا تعین کرنے سے متعلق احکامات صادر کرتی ہیں ۔

فاضل جج نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ یہ قوانین اور ان کی متعلقہ دفعات نہ صرف قرار داد مقاصد کی زد میں آتی ہیں ، بلکہ یہ مسلمانوں کو قرآن وسنت کے عین مطابق زندگی بسر کرنے سے روکتی ہیں ۔ اس لیے یہ عدالت ان قوانین کے تحت ایسا کوئی فیصلہ اور حکم جاری نہیں کر سکتی جو اُن کے نفاذ اور ان پر عمل در آمد سے تعلق رکھتا ہو۔ فاضل جج نے ان تنقیحات قانونی کی بنا پر مقدمہ ارشاد احمد خان بنام مسز پروین اعجاز میں ایک لاکھ نوّے ہزار کی قابلِ وصول اصل رقم جمع پندرہ فیصد سود کی ادائیگی کے دعوے کو صرف اصل زر کی حد تک منظور کیا ہے اور سود کی رقم کو جس کا ذکر پرومزری نوٹ میں درج تھا ، قرآن وسنت کے منافی ہوتے ہوئے مسترد کر دیا ہے۔ سود کی حرمت کے متعلق قرآن کریم کی آیات ، احادیثِ نبوی اور مفسرینِ قرآن کے حوالہ جات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں فاضل جج نے اس بات پر زور دیا ہے کہ سود کے متعلق ارشادات ربانی میں آخری اور واضح ارشاد یہ ہے کہ اگر تم سود کو معاف نہیں کرتے جو ماضی کے معاہدوں سے تمہارے حق میں بن گیا ہے اور آئندہ کے لیے اس کو ترک نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ ۔ اور اس کے بعد پھر ایک مشورہ قرآن میں آیا کہ تمہارے حق میں بہتر یہ ہے کہ صرف اصل زر کی وصولی پر اکتفا کرو اور پھر یہ انتباہ ہے کہ ہر شخص کو بالآخر یوم حساب اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ اور تب اسے وہی کچھ ملے گا جو اس نے دنیا میں کمایا ہے۔

فاضل جج نے اس امر پر بھی بحث کی ہے کہ بعض لوگ سود مفرد کو ربوٰا نہیں سمجھتے اور صرف سود مرکب کو ربوٰا کی زد میں قرار دیتے ہیں ۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ دلیل دی ہے کہ قرآنِ کریم نے جب یہ کہا (سورہ مائدہ ۴۴-۵) "میری آیات کا معمولی معاوضہ پر سودا نہ کرو"۔ تو کیا اس کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ بھاری یا زیادہ معاوضہ پر سودا کرنے کی اجازت دی گئی ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ، یہ تو اندازِ بیان کی بات ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان کو ساری دنیا بھی آیاتِ قرآنی فروخت کرنے کے

عوض بیش کی جائے تو وہ بھی کم ہوگی۔ اور اُسے یہ سودا نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے سُود کے معاملے میں الفاظ اضعافاً مضاعفہ صرف اس وقت عالمِ عرب میں نافذ سُودی نظام کے ذریعے دولت میں اضافے کی بے پناہ شرح کی شدت کو واضح کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ فاضل جج نے لکھا ہے کہ ربوٰا کا لفظ سُود کے لیے قرآن میں ایک عمومی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

فاضل جج نے بعد ازاں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور مختلف عدالتوں کے فیصلوں میں اس موضوع پر کی گئی بحث اور قرار دادِ مقاصد کو قابلِ نفاذ بنائے جانے کے اثرات سے متعلق خود اپنے سابقہ فیصلے مقدمہ بنک آف اومان بنام الیسٹ ٹریڈنگ کمپنی کے حوالہ سے یہ قرار دیا ہے کہ نیگوشی ایبل انسٹرومنٹ ایکٹ ۱۸۸۱ء کی دفعات ۷۹، ۸۰ اور ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۳۴ اور حکم نمبر ۳۷ کی دفعہ ۲ جہاں تک ان کا تعلق قرضہ کے طور پر دی گئی کسی رقم پر سُود کی وصولی کے مطالبہ سے ہے۔ قرآن وسنت کے منافی اور قرار دادِ مقاصد کی دفعہ ۳ اور آئین کی دفعہ ۲ اے کے تحت ناجائز اور کالعدم ہیں۔ کیونکہ مذکورہ قوانین اور دفعات پاکستان کے مسلمانوں کو سُود کے معاملہ کی حد تک قرآن وسنت کے مطابق زندگی بسر کرنے سے روکتے ہیں۔ لہٰذا مذکورہ بالا قوانین اور ان کی متذکرہ دفعات کو یہ عدالت اپنے فیصلہ اور حکم کے ذریعے نافذ نہیں کرسکتی۔ فاضل جج نے لکھا ہے کہ میں آئین کی دفعہ نمبر ۱۸۹ کو بخوبی سمجھتا ہوں اور یہ بات میرے ذہن میں ہے کہ فاضل سپریم کورٹ کے فیصلے پاکستان کی عدالتوں کے لیے لائقِ تعمیل ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں آئین کی دفعہ ۲ اے کے تقاضوں کا بھی پابند ہوں۔ اور چونکہ میں یہ قرار دے چکا ہوں کہ قرار دادِ مقاصد اور دفعہ ۲ اے ایک بنیادی قانون بلکہ ما فوق الآئین دستاویز ہے۔ اس لیے یہ دفعہ ۱۸۹ پر بھی حاوی ہے۔ اور ان فیصلوں پر بھی جو فاضل سپریم کورٹ نے دفعہ ۲ اے کے آئین میں شامل کیے جانے سے پہلے دیئے تھے یا جن میں اس حقیقت پر غور نہیں کیا گیا۔ ان کے بارے میں بصد ادب و احترام میری یہ ناچیز رائے ہے کہ وہ فیصلے بھی دفعہ ۲ اے کے تقاضوں کے تابع ہیں۔

دوسرا مقدمہ حبیب بنک بنام محمد حسین حبیب بنک کی طرف سے دیئے گئے دس لاکھ کے قرضے پر اصل زر کے علاوہ تقریباً نو لاکھ روپے سُود کی وصولی کا دعویٰ کیا گیا ہے جس کے فیصلے میں فاضل جج نے جزوی طور پر سُود کی ادائیگی کی ڈگری جاری کرنے سے انکار کرتے ہوئے سندھ ہائی کورٹ

کے فل بنچ کے ایک فیصلے کی بنا پر بنکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈی ننس ۱۹۷۹ء کو کالعدم قرار دیتے کے معاملے میں دائرہ اختیار کی تحدید کی بنا پر اپنی بے بسی اور معذوری کا اظہار کیا ہے۔ فاضل جج نے لکھا ہے کہ آئین کی دفعہ ۲۷۰ الف جو اتفاق سے قرارداد مقاصد کو قابلِ نفاذ قرار دینے والی دفعہ ۲ الف کے ساتھ ایک ہی تاریخ میں آئین کا حصہ بنائی گئی ہے۔ اس دفعہ ۲۷۰ الف کے تحت بنکنگ کمپنیز آرڈی ننس کو قانونی تحفظ حاصل ہو گیا ہے جیسے سندھ ہائی کورٹ نے بھی مقدمہ محمد سہیل میمن بنام حکومت سندھ (پی ایل ڈی ۱۹۸۷ء ص ۲۹۶) کے فیصلے میں تسلیم کیا ہے، اس لیے کہ وہ عدالتِ عالیہ کے اس حکم کے پابند ہیں۔ تاہم انہوں نے یہ قرار دیا ہے کہ دفعہ ۲ الف کے نفاذ یعنی ۲ مارچ ۱۹۸۵ء سے مقدمہ زیر بحث کے اندراج کی تاریخ یعنی ۳ جولائی ۱۹۸۶ء تک ایک قانونی نکتہ کی بنا پر سود کی ادائیگی کا کوئی جواز نہیں اس لیے انہوں نے تقریباً ۵ لاکھ روپے کی حد تک سود کی ادائیگی کے مطالبہ کو قرآن وسنت کے منافی ہونے کی بنا پر اور قرارداد مقاصد کی زد میں آنے کی بنا پر مسترد کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے فیصلہ میں لکھا ہے کہ میں بادل ناخواستہ اس کے قبل کے عرصے کے سود کی ادائیگی کے بارے میں مدعی حبیب بنک کے حق میں حکم جاری کر رہا ہوں۔

فاضل جج نے جس طرح کے سود کو ناجائز قرار دینے کے معاملے میں بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے ادائیگی کا حکم جاری کیا ہے اس کے سود کی رقم تقریباً ۴ لاکھ روپے بنتی ہے اور چونکہ مدعا علیہ پہلے ہی مختلف مواقع پر اتنی رقم کی ادائیگی کر چکا ہے اس لیے دس لاکھ روپے اصل زر کی ادائیگی کے لیے ڈگری بمعہ اخراجات مقدمہ جاری کی جاتی ہے۔ اور اس رقم کی وصولی کے لیے مدعی کو حق ہو گا کہ ضمانت کے طور پر پیش کی گئی جائیداد کی فروخت سے رقم حاصل کرے۔

فاضل جج نے اس معاملہ میں دائرہ اختیار کی بنا پر اپنی جس بے بسی کا اظہار کیا ہے اس کی مثال کے طور پر اپنے تفصیلی فیصلے میں دلائل کے طور پر آزاد جموں وکشمیر ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ کا بھی حوالہ دیا ہے، جو سردار عبدالرزاق بنام حکومت آزاد جموں وکشمیر (پی ایل ڈی ۸۶ ص ۱۸۵ الف جے کے) نامی مقدمہ میں مسٹر جسٹس محمد اکرم خان نے دیا ہے۔ اور اس میں قرآن کریم کی آیات سورۂ بقرہ ۲۷۹-۲۷۸ کا حوالہ دیا ہے۔ فاضل جسٹس محمد اکرم خاں نے لکھا ہے!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد اتنا واضح ہے کہ اس کے بعد کسی شکل میں بھی سود کے لین دین کی گنجائش باقی نہیں

رہتی - لہٰذا ہم سُود کی رقم محکمہ امداد باہمی کو دلانے سے اجتناب کریں گے - اس بارے میں ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعلانِ جنگ کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے - محکمہ امداد باہمی کو چاہیے کہ وہ قرضِ حسنہ سمجھ کر صرف اصل زر ہی وصول کرے - ہم محکمہ کو ۳۰۲ روپے کا سُود بادل ناخواستہ دلاتے ہیں - کیونکہ ثالث نے فیصلہ دیا ہے ورنہ یہ رقم بھی منافع نہیں - (دستاویزات میں اس فیصلہ کا ذکر تھا)

فاضل جسٹس محمد اکرام اللہ خاں نے لکھا ہے کہ اگرچہ آزاد کشمیر میں احترامِ رمضان ایکٹ، زکوٰۃ ایکٹ اور اسلامی تعزیرات ایکٹ وغیرہ نافذ ہو چکے ہیں، اور یہ سارے قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہیں - لیکن کنٹریکٹ ایکٹ بھی موجود ہے اور اسے ابھی تک مشرف بہ اسلام نہیں کیا گیا - اور ربوا کی ممانعت کے بارے میں ابھی تک کوئی قانون نافذ نہیں کیا گیا - اس لیے ہم مدعا علیہ کے وکیل کی اس دلیل سے اتفاق کرنے سے معذور ہیں کہ آزاد کشمیر میں سُود کی وصولی کی ممانعت کا قانون موجود ہے - عدالتِ عظمیٰ آزاد کشمیر کا فیصلہ عدالت عالیہ کے لیے لائق تعمیل ہے - اور عدالتِ عظمیٰ پاکستان نے بھی یہی قرار دیا ہے کہ جب تک مجلسِ قانون ساز کی طرف سے کوئی قانون پاس ہو کر نہ آجائے، عدالتیں از خود کسی قانون کو خلافِ شریعت قرار نہیں دے سکتیں -

فاضل جسٹس تنزیل الرحمٰن نے نیگوشی ایبل انسٹرومنٹ ایکٹ کی دفعہ ۸۰-۷۹ اور ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۳۴ اور حکم نمبر ۳۷ کی دفعہ ۲ کو قرآن و سنت کے منافی قرار دینے اور منسوخ کرنے کا فیصلہ ۱۱ رجون ۸۷ء کو سنایا تھا اور اسے قانونی حوالہ کے طور پر اشاعت کے لیے ۱۱ رجون کو جاری کیا گیا -

دوسرا فیصلہ مقدمہ حبیب بنک بنام محمد حسین مقدمہ نمبر ۴۶۰ - ۱۹۸۵ء میں فاضل جج نے اپنا فیصلہ ۳۰ رجون ۸۷ء کو سنایا ہے اور اسے بھی قانونی حوالہ کے طور پر اشاعت کے لیے منظور کیا ہے - جس کے ذریعے انہوں نے آئین کی دفعہ ۲۰۷ اے کے تحت سندھ ہائی کورٹ فل بنچ کے فیصلے کی روشنی میں بنکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈی نینس ۱۹۷۹ء کو کالعدم اور قرآن و سنت کے منافی قرار دینے سے معذوری اور بے بسی کا اظہار کیا ہے -

فاضل جج نے قانونِ سُود یعنی انٹرسٹ ایکٹ ۱۸۳۹ء کو بھی قرآن و سنت کے منافی ہونے کی بنا پر کالعدم قرار دیا ہے - اس معاملہ میں عدالت کے دائرہ اختیار سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ آئین کی دفعہ ۲۰۳ بی کے مطابق کوئی عدالت بشمول سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ ان معاملات میں

اختیاراتِ سماعت نہیں رکھتی، جو وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار میں دیئے گئے ہیں۔ اور جیسا کہ خود شرعی عدالت نے متعدد فیصلوں میں خود قرار دیا ہے کہ مالیاتی قوانین اس عدالت کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں، لہٰذا عام دائرۂ اختیار کی تمام عدالتیں ان تمام معاملات میں جو شرعی عدالت کے دائرہ اختیار میں نہیں سماعت اور فیصلہ کا اختیار استعمال نہیں کرسکتی ہیں۔

اس بحث میں فاضل جج نے وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس گل محمد کے اس مقالے کا حوالہ جو انہوں نے پانچویں جیورسٹ کانفرنس منعقدہ کراچی مارچ ۸۶ء میں پڑھا تھا۔ اور پی ایل ڈی ۱۹۸۶ء ص ۲۴۹ میں شائع ہوا ہے، جس میں جسٹس گل محمد نے کہا "فیڈرل شریعت کورٹ صرف اپنے دائرہ اختیار کے معاملات میں قوانین کو اسلام کے منافی قرار دے سکتی ہے، لیکن درخواست دہندہ یا فریقین کو سہولت اور رعایت نہیں دے سکتی۔ جب کہ شریعت کورٹ کے برعکس ہائی کورٹوں کے لیے ماسوائے ملٹری قوانین کے اور کوئی استثنا نہیں ہے اور وہ فریقینِ مقدمہ کو ریلیف اور فوری ریلیف بھی فراہم کرسکتی ہے۔

لہٰذا ایسی صورت میں ہائی کورٹ نہ صرف قوانین کو اسلام کے منافی قرار دے سکتی ہیں، بلکہ درخواست دہندہ کو ریلیف بھی دے سکتی ہیں۔ لہٰذا شریعت کورٹ کے ذریعہ دادرسی ناکافی ہے۔ جب کہ فریقین ہر قسم کی رٹ اور شریعت پٹیشن بھی ہائی کورٹ میں لے جاسکتے ہیں۔ اس طرح مجوزہ نویں آئینی ترمیمی بل کی تمام اہمیت ختم ہوجاتی ہے۔ کیونکہ اس سے تو جو فائدہ حاصل ہوسکتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ شریعت کورٹ کو بھی ممنوعہ دائرہ میں اختیار سماعت دے دیا جائے۔ لیکن فریقین کو وہاں سے ریلیف تو پھر بھی نہ ملے گی اور انہیں بعدازاں ریلیف کے لیے ہائی کورٹ میں جانا ہوگا۔

فاضل جج مسٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن نے آئین کی دفعہ ۲۷۰ اے کے ذریعے مارشل لا کے دور میں نافذ ہونے والے قوانین کو ملے ہوئے تحفظ کی بنا پر یہ فیصلہ دیا ہے کہ بینکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈیننس ۱۹۷۹ء کو قراردادِ مقاصد کی روشنی میں منسوخ اور کالعدم قرار دینا ان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔

اس ضمن میں فاضل جج نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا ہماری پارلیمنٹ کو آئین کی دفعہ ۲ اے کے تحت عائد کردہ فرائض کی روشنی میں ایسے قوانین بنانے، ان کی توثیق کرنے، انہیں قبول کرنے اور جائز قرار

دینے کا اختیار ہے جو واضح طور پر اللہ کی حاکمیت اور قرآن و سنت کی بالادستی کے منافی ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے تو کیا پھر ہماری پارلیمنٹ خلاف وضع فطری فعل کی اجازت دینے یا حرام کاری کو جائز قرار دینے یا نکاح اور شادی کے بغیر تعلقاتِ زن و شو کو درست فعل قرار دینے کے لیے قانون بنا سکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر آخر پارلیمنٹ کس طرح بنکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈی ننس ۱۹۷۹ء جیسے قانون یا اگر آرڈی ننس نمبر ۵۹ آف ۱۹۸۰ء کو جواز کی سند اور توثیق عطا کر سکتی ہے، جو عدالت کو سود کی ادائیگی کا حکم جاری کرنے کا پابند بناتے ہیں، حالانکہ قرآن و سنت کی رُو سے سود قطعاً حرام ہے اور جو اس کے لین دین سے اجتناب نہیں کرتے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے اعلانِ جنگ کے مرتکب قرار دیے گئے ہیں۔ (سورہ البقرہ۔ آیت ۲۷۹)۔

ضروری گذارش

ہمارا کام کچھ میدانِ جنگ والوں کی نوعیت کا ہے۔ پچھلے شمارے کا نقشہ یکایک تبدیل کر کے اسے شریعت بل نمبر بنا دیا۔ اب لکھے لکھائے پرچے کو تبدیل کر کے ۱۵ صفحے اہم عدالتی فیصلوں کے داخل کیے۔ نتیجہ یہ کہ اشارات متاثر، مقالات متاثر، مطبوعات متاثر۔ اشاعت میں تاخیر۔

کچھ ہم پریشان، کچھ آپ پریشان!

مگر میدانِ جنگ میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔

(خ۔ ص۔)

علمائے سلف اور وقت کی قدر و قیمت

جناب شیخ نذیر حسین صاحب - دائرۃ معارف اسلامیہ - جامعہ پنجاب - لاہور

(شیخ عبدالفتاح ابوغدہ شام کے نامور فاضل محقق اور جلیل القدر محدث ہیں اور آج کل الریاض کے کلیۃ الشریعہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ موصوف کو ہندوستانی علماء مثلاً مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا انور شاہ اور مولانا ظفر احمد تھانوی مرحومین کے علاوہ اکابر علمائے اسلام کی تصانیف سے بڑی دلچسپی ہے اور ان کو تحقیق و تصحیح اور تحشیہ کے جملہ لوازمات سے اعلیٰ معیار پر شائع کرتے رہتے ہیں۔

چند برس ہوئے کہ انہوں نے جامع ریاض میں "علمائے سلف اور وقت کی قدر و قیمت" پر چند خطبات دیئے تھے جو "قیمۃ الزمن عند العلماء" کے عنوان سے ایک کتابچے کی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ قارئین ترجمان القرآن کی دلچسپی کے لیے اردو میں اُن کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔ نذیر حسین)

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں حدِ شمار سے باہر ہیں۔ ان میں علم اور جسم میں کشادگی اور مال و دولت کی فراوانی ہے۔ صحت و عافیت کی ارزانی ہے اور فرصتِ وقت سے فائدہ اٹھانا بھی ہے۔ زمانے (وقت) کی اہمیت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ یعنی قسم ہے زمانے کی کہ انسان بڑے خسارے میں ہے۔ خسران اور محرومی ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے وقت کی قدر نہ کی اور ساری فرصتِ عمر برباد کر دی۔ عمرِ انسانی

کے لمحات دیکھتے دیکھتے گذر جاتے ہیں اور انسان خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔

امام فخر الدین رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: عصر (زمانہ) وہی ظرف ہے جس کے اندر حیرت انگیز واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے اندر انسان سب کچھ کرتا ہے اور تنگی و ترشی، سختی و نرمی، تنگ دستی اور فراخدستی اس پر گذرتی ہے، لہٰذا عمرِ انسانی کے اوقات بہت ہی قیمتی ہیں۔ (مفاتیح الغیب، جلد ۴، ص ۸۴)

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ جن سے لوگ کما حقہ فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اور وہ صحت اور فرصتِ وقت ہے۔

امام ابن قیم نے زاد المعاد میں وقت اور اس کی قدر و قیمت پر بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وقت دیکھتے ہی دیکھتے گذر جاتا ہے، جس کا تدارک ناممکن ہے۔ اس کو کسی قیمت پر واپس نہیں لایا جاسکتا۔ فرصتِ وقت ضائع کرنے والا ساری عمر ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔ اور اس پر ندامت بھی مزید وقت کے ضائع کرنے کے مترادف ہے، اس لیے جب موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو سوائے حسرت و محرومی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

وقت کی پوری پوری قدر کرنا اور عمرِ عزیز کے ایک ایک لمحے سے فائدہ اٹھانا سلفِ صالحین کا شعار رہا ہے۔ علمائے سلف تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف، دعوت و تذکیر، ذکر و عبادت اور خلقِ خدا کی خدمت اور راحت رسانی میں لگے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض اکابر کے حالات و واقعات موجودہ نسل کی رہنمائی کے لیے لکھے جاتے ہیں۔

عامر بن عبد قیس ایک زاہد مرتاض تابعی تھے۔ ایک شخص نے ان سے کہا: آؤ بیٹھ کر باتیں کریں، انہوں نے جواب دیا تو پھر سورج کو بھی ٹھہرا لو، یعنی زمانہ تو ہمیشہ متحرک رہتا ہے اور گذرا ہوا زمانہ واپس نہیں آتا ہے، اس لیے ہمیں اپنے کام سے غرض رکھنی چاہیے اور بے کار باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

امام ابو یوسف قاضیؒ (۱۱۳ تا ۱۸۲ھ)، امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد رشید اور قاضی القضاۃ تھے۔ انہوں نے تین خلفائے عباسیہ یعنی مہدی، ہادی اور ہارون الرشید کا زمانہ پایا تھا۔ ان کی فقہ و فتاوٰی کی بیشتر دنیائے اسلام پر حکمرانی تھی۔ وہ آخری دفعہ بیمار ہوئے تو ان کے ایک شاگرد ابراہیم

بن الجراح ان کی عیادت کو گئے ، جب کہ اُن پر بے ہوشی طاری تھی ۔ جب ذرا ہوش آیا تو امام ابو یوسف نے ابراہیم سے پوچھا کہ حج میں رمیِ جمار (کنکریاں مارنا) پیدل افضل ہے یا سوار ہو کر ۔ ابراہیم نے متعجب ہو کر کہا کہ آپ اس نازک وقت میں بھی علمی مسائل کی تحقیق میں مصروف ہیں ۔ امام صاحب نے جواب دیا کہ کوئی مضائقہ نہیں، شاید یہ بات کسی کے کام آسکے ۔ ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے اپنی رائے ظاہر کی اور امام صاحب نے اپنی تحقیق بیان کی ۔ اس کے بعد امام صاحب پر حالتِ نزع طاری ہونے لگی تو میں اُٹھ کھڑا ہوا ۔ میں اُن کے گھر سے باہر نکلا ہی تھا کہ گھر سے رونے اور چلانے کی آوازیں آنے لگیں ۔ معلوم ہوا کہ میرے باہر نکلتے ہی ان کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی رحمۃ اللہ علیہ ۔ امام ابو یوسفؒ نے مہد سے لے کر لحد تک تحصیلِ علم کی عملی مثال پیش کر دی ۔

شیخ محمد بن سلام البیکندی (م ۲۲۷ھ) کا شمار امام بخاریؒ کے شیوخ میں ہے ۔ حافظ محمود العینی ، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ اُن کا قلم ٹوٹ گیا تو انہوں نے صدا لگائی کہ مجھ کو نیا قلم ایک دینار میں کون دیتا ہے ۔ لوگوں نے ان پر نئے قلموں کی بارش کر دی ۔ یہ تھا ہمارے علمائے سلف کی دریا دلی کا حال کہ وہ ایک قلم کو ایک دینار کے بدلے خرید لیتے ہیں ، تاکہ لکھتے لکھتے ان کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہو اور ان کے خیالات کا تسلسل جاری رہے ۔

"تاریخِ بغداد" کے مشہور مصنف خطیب بغدادی ابوالعباس المبرد کے حوالے سے اپنی کتاب تقیید العلم (ص ۱۳۹) میں لکھتے ہیں کہ میں نے تین آدمیوں سے زیادہ کسی کو علم کا حریص نہیں پایا ۔۔۔ اور وہ امام ادب جاحظ (۱۶۳ تا ۲۵۵ھ) ، مشہور ادیب اور شاعر فتح بن خاقان (م ۲۴۷ھ) اور فقہ مالکی کے امام اسماعیل بن اسحاق تھے ۔ جاحظ کتاب فروشوں کی دوکانیں کرایہ پر لے کر ساری رات کتابیں پڑھتا رہتا تھا ۔ فتح بن خاقان خلیفہ عباسی المتوکل کا وزیر تھا ۔ وہ اپنی آستین میں کوئی نہ کوئی کتاب رکھتا تھا ۔ اور جب بھی اُسے سرکاری کاموں سے ذرا فرصت ملتی تو وہ کتاب آستین سے نکال کر پڑھنے لگ جاتا تھا ۔ رہا اسماعیل بن اسحاق القاضی تو جب بھی ہم اس کے گھر جاتے تو اس کو لکھنے پڑھنے میں مصروف پاتے ۔

امام ابن جریر طبری (۲۲۴ تا ۳۱۰ھ) نے ۸۶ برس کی عمر پائی ۔ ان کی عادت تھی کہ وہ ہر روز چودہ ورقے لکھ لیا کرتے تھے ۔ ان کی مشہورِ عالم تفسیر اور تاریخ کے صفحات کی تعداد آٹھ ہزار

کے قریب ہوگی۔

ان کے شاگرد قاضی ابوبکر بن کامل ان کے نظام الاوقات کی تفصیل اس طرح لکھتے ہیں:

"ابن جریر طبری، ظہر کی نماز گھر میں پڑھ کر عصر تک تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے بعد نمازِ عصر پڑھنے مسجد میں چلے جاتے، نماز سے فارغ ہو کر درس و تدریس میں مغرب تک منہمک رہتے، پھر عشاء تک فقہ کا درس دینے اور نماز ادا کرنے کے بعد گھر چلے آتے۔ اس طرح انہوں نے اپنے اوقات کو دین اور خلقِ خدا کی خدمت میں تقسیم کر رکھا تھا۔"

استاد محمد کُرد علی نے لکھا ہے کہ امام ابن جریر طبری نے اپنی عمرِ عزیز کا ایک لمحہ بھی افادے اور استفادے کے بغیر ضائع نہیں کیا۔ بعض معتبر شاہدوں نے بیان کیا ہے کہ آخری وقت کسی نے ان کو امام جعفر بن محمد کی ایک دُعا بتلائی، امام طبریؒ نے کاغذ اور دوات منگوا کر یہ دُعا لکھ لی۔ ایک گھڑی کے بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔

ابوریحان بیرونی (م ۳۶۲ تا ۴۴۰ھ) پانچ زبانوں یعنی عربی، سریانی، فارسی، سنسکرت اور ہندی کا ماہر اور علم ہیئت اور طب، ریاضی، ادب، لغت اور تاریخ میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اس کی تصانیف کی تعداد ایک سو سے متجاوز ہے۔ مشہور مستشرق زخاؤ نے لکھا ہے کہ البیرونی فاضل یگانہ تھا۔

سارٹن نے تاریخ العلوم میں البیرونی کو دُنیا کے بہت بڑے عالموں میں شمار کیا ہے۔ اس کے شوقِ علم کا یہ حال تھا کہ وہ مرنے سے چند منٹ پیشتر ایک فقیہ سے جو ان کی مزاج پُرسی کے لیے آیا ہوا تھا، علم الفرائض کا ایک مسئلہ پوچھ رہا تھا۔

امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک جوینی (۴۱۹ تا ۴۷۸ھ)، امامِ فقہ، مشہور متکلم اور امام غزالی کے استاد تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں سونے اور کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ مجھ کو دن اور رات میں جب بھی نیند آجاتی ہے سو جاتا ہوں اور جس وقت بھوک لگتی ہے کھانا کھا لیتا ہوں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا پڑھنا اور پڑھانا تھا۔ ایک دفعہ قیروان (تونس) سے ایک نحوی آئے تو امام الحرمین نے سبب کہ اُن کی عمر پچاس سے اُوپر ہو چکی تھی اور وہ خود مرجعِ خلائق تھے، اس عالمِ نحو سے ایک

کتاب درساً پڑھی۔

اب ہم دو عظیم المقدر حنبلی علماء کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے خود کو درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور وعظ و نصیحت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اور وہ امام ابوالوفا ابن عقیل اور ان کے نامور شاگرد ابن جوزی ہیں۔ ابن عقیل (م ۴۳۱ھ تا ۵۱۳ھ) اپنے زمانے کے ممتاز ترین فاضل اور فہم و ذکاوت میں عدیم النظیر تھے۔ انہوں نے مختلف علوم و فنون میں بہت سی کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں ایک کتاب "الفنون"[1] خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جو ابن رجب کے مطابق اسّی جلدوں میں تھی۔ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ جب ابن عقیل کا آخری وقت آگیا اور ان کی سانس اکھڑنے لگی تو گھر والے رونے لگے۔ انہوں نے کہا "میں پچاس برس سے لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے فتویٰ نویسی کر رہا ہوں اور اب مجھ کو امن و چین سے اللہ کے حضور حاضر ہونے دو"۔ انہوں نے مرنے کے بعد کپڑوں اور کتابوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں چھوڑا۔ کفن و دفن کے اخراجات گھر سے بمشکل پورے ہو سکے۔

ابن جوزی (۵۰۸ تا ۵۹۷ھ) کے بارے میں ابن رجب حنبلی نے امام ابن تیمیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابن جوزی کی چھوٹی اور بڑی کتابوں کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ ہے۔ وہ اپنی عمر کا ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرتے تھے۔ مطالعہ و تحقیق، تصنیف و تالیف اور وعظ و تذکیر سے ان کی طبیعت سیر نہیں ہوتی تھی۔ وہ قلم کے تراشے سنبھال کر رکھ چھوڑتے تھے، چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان تراشوں سے پانی گرم کر کے ان کو غسل دیا گیا۔ وہ صید الخاطر میں (جو اُن کی زندگی کا دلچسپ روزنامچہ ہے) ان لوگوں پر کفِ افسوس ملتے ہوئے نظر آتے ہیں، جو کھیل تماشے میں لگے رہتے ہیں، اِدھر اُدھر بلامقصد گھومتے رہتے ہیں، بازاروں میں بیٹھ کر آنے جانے والوں کو گھورتے رہتے ہیں اور قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ پر رائے زنی کرتے رہتے ہیں۔

امام فخر الدین رازی (۵۴۳ تا ۶۰۶ھ) کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد ایک سو سے کم نہ ہوگی۔ صرف تفسیر کبیر تیس جلدوں میں ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کھانے پینے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے، میں ہمیشہ اس پر افسوس کرتا رہتا ہوں۔

---

[1] اب "الفنون" کے چند اجزا شائع ہو گئے۔

امام نووی (محی الدین ابوزکریا، ۶۳۱ تا ۶۷۶ھ) شیخ الاسلام، حافظِ حدیث، اور بڑے اللہ والے تھے۔ وہ ایک دن میں بارہ اساتذہ سے علمِ حدیث، علمِ فقہ، اصول فقہ، نحو اور ادب وغیرہ کا درس لیتے تھے۔ انھوں نے اتنی تصانیف اپنے پیچھے چھوڑی ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

ابنِ نفیس (علاء الدین ابن حزم) دمشقی (۶۱۰ تا ۶۸۷ھ) علمِ طب کے امام تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے انسانی جسم میں دورانِ خون کا انکشاف کیا تھا۔ ان کے گھر کا دروازہ ہمیشہ غریب و امیر، طلبہ و حاجت مندوں اور مریضوں کے لیے کھلا رہتا تھا۔ عمر بھر شادی نہیں کی اور سارا مال و متاع حتیٰ کہ کتابیں بھی بیمارستان (ہسپتال) منصوری پر وقف کر دیں۔ جب وہ آخری بار بیمار ہوئے اور بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی تو ان کے بعض شاگردوں نے صحت یابی کے لیے شراب تجویز کی — ابن نفیس نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس حال میں حاضر نہیں ہونا چاہتا کہ میرے پیٹ میں شراب کا ایک قطرہ بھی ہو۔ ان کی خاکساری اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ وہ شاگردوں کو سند دیتے وقت اپنے نام کے ساتھ "ایک اناڑی طبیب" بھی لکھ دیا کرتے تھے، حالانکہ وہ اپنے زمانے کے رئیس الاطباء تھے۔

صلاح الدین صفدی نے الوافی بالوفیات میں لکھا ہے کہ ابن نفیس اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود لکھنے پڑھنے کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے۔ انھوں نے طب کے علاوہ علمِ فقہ میں بھی بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کا دستور تھا کہ وہ لکھتے وقت دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے تھے اور کتاب دیکھے بغیر سیلِ رواں کی طرح لکھتے جاتے تھے۔ ان کے پاس قلموں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ ایک قلم گِھس جاتا تو وہ فوراً دوسرا قلم لے کر لکھنا شروع کر دیتے تھے۔

ساتویں، آٹھویں صدی ہجری کی ایک ممتاز اور یگانہ روزگار شخصیت امام ابن تیمیہؒ ہیں۔ وہ اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے تھے۔ اگر ان کے دن پڑھنے پڑھاتے، مناظرے و مذاکرے اور دعوت و تذکیر میں صرف ہوتے تھے تو راتیں تلاوت و نوافل اور اللہ کے ذکر میں گزرتی تھیں۔ بعض تفردات کی وجہ سے انھیں قید و بند کے مصائب سے بھی گزرنا پڑا۔ انھوں نے تاتاریوں کے خلاف جہاد میں بھی قائدانہ حصہ لیا تھا۔ اور ان کو شکست فاش دی تھی۔ آلام و مصائب سے بھرپور زندگی کا تقاضا تھا کہ وہ تصنیف و تالیف سے دلچسپی نہ رکھتے، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی چھوٹی

بڑی کتابوں اور رسائل و فتاویٰ کی تعداد ساڑھے تین سو سے زیادہ ہے۔ ان کے محبوب شاگرد امام ابن قیم نے ان کی تصانیف کی فہرست بائیس صفحات میں لکھی ہے جو مشہور شامی فاضل صلاح الدین المنجد کی علمی کاوش سے شائع ہو چکی ہے۔

کثیر التصانیف مصنفین میں خطیب بغدادی، ابن عساکر مصنّف تاریخ دمشق، ابن حزم اندلسی، الذہبی، السیوطی، بدر عینی اور حافظ ابن حجر شارح صحیح بخاری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جو تعلیم و تدریس اور وعظ و نصیحت کی مشغولیتوں کے باوجود تصنیف و تالیف اور ذکر و عبادت میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ان میں بعض علماء قلم تراشنے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی زبانی تلاوت بھی کرتے رہتے تھے۔

متاخرین میں سے علامہ شہاب الدین محمود آلوسی مشہور مفسرِ قرآن نے اپنی رات کے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ پہلے حصے میں آرام و استراحت فرماتے تھے، دوسرے میں اللہ کو یاد کیا کرتے تھے۔ اور تیسرے میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ وہ رات کے پچھلے پہر میں اتنا کچھ لکھ لیتے تھے، جسے اُن کے کاتب سارا سارا دن لکھتے رہتے تھے۔ اسی دور میں سید مرتضیٰ بلگرامی شارح قاموس و احیاء علوم الدین اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی بھی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، جنہوں نے اپنی عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ عوام الناس کی دینی رہنمائی اور علوم دینیہ کی نشر و اشاعت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ہم مولانا اشرف علی تھانوی کے ذکر پر اس موضوع کا اختتام کرتے ہیں، جن کی چھوٹی بڑی کتابوں اور رسائل اور مواعظ کی تعداد ایک سو سے اُوپر ہے۔

نئی نسل کی رہنمائی اور وقت کی صحیح قدر و قیمت کی پہچان اور اس کے بہترین استعمال کے لیے ہم نے چند اکابرِ اسلام کے سبق آموز حالات اُوپر لکھ دیے ہیں۔ ورنہ یہ موضوع بحرِ ناپیدا کنار ہے، جس کے لیے متعدد تصانیف بھی ناکافی ہیں۔

آخر میں ہم اخوان المسلمون کے مرشدِ عام امام حسن البنّا کا ایک مقولہ لکھ دیتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: "جس نے وقت کا حق پہچان لیا اس نے زندگی کی حقیقت پالی، کیونکہ وقت ہی زندگی کا دوسرا نام ہے۔"

اسلام میں اختلاف کے آداب

(۵)

عہدِ صحابہ میں اختلاف اور اس کے آداب (۲)

ترجمہ و تلخیص جناب عبد الحی ابڑو صاحب - اسلامی یونیورسٹی - اسلام آباد

حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے مابین چند اختلافات

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ صحابہ کرام میں سب سے زیادہ قرآنی علوم اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو جو قربت حاصل تھی، اس کی بنیاد پر بہت سے صحابہ کرام آپ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں شمار کرتے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں: "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بہت زیادہ آمد و رفت اور ان کے ساتھ قرب و تعلق کی وجہ سے ایک عرصے تک ہم ابن مسعودؓ اور ان کی والدہ کو اہلِ بیت ہی سے سمجھتے رہے۔[۱]

حضرت ابومسعود بدریؓ نے ایک دفعہ حضرت ابن مسعود کو آتے ہوئے دیکھا تو ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے: "میرے خیال میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے ان سے بڑھ کر کتاب و سنت کا علم رکھنے والا کوئی نہیں چھوڑا۔ یہ سن کر ابوموسیٰ اشعریؓ نے کہا: آپ سچ کہتے ہیں، اس لیے کہ ہم جب غیر حاضر ہوتے تو یہ موجود رہتے۔ ہمیں جب روک دیا جاتا تب بھی انہیں اجازت ہوتی۔[۲]

۱؎ صحیح مسلم - احکام ابن حزم ۶/۶۳

۲؎ ایضاً

حضرت عمرؓ کی جلالتِ شان اور فقہ میں ان کا مقام معروف و مسلّم ہے۔ انہوں نے حضرت ابن مسعودؓ کو امورِ خلافت کی ادائیگی میں اپنا معاون بنا رکھا تھا۔ بہت سے اجتہادی مسائل میں آپ کی رائے حضرت عمرؓ کی رائے کے اس قدر مطابق ہوتی کہ اسلامی قانون سازی کے مؤرخین کا کہنا ہے کہ وہ صحابہ کرام میں سب سے زیادہ حضرت عمرؓ سے متاثر تھے۔ اکثر اوقات دونوں حضرات کا اجتہاد اور طریقۂ استدلال تک یکساں ہوتا تھا۔ بعض فقہی مسائل میں آپ نے اپنے اجتہاد سے رجوع کر کے حضرت عمرؓ کے اجتہاد کو اختیار کر لیا تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دادا کی موجودگی میں بھائیوں کو میراث سے حصّہ دینے کے مسئلے میں آپ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا۔ بھائی کے انتقال کی صورت میں جب اس کے ورثاء دادا اور دوسرے بھائی ہوں تو امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے مطابق ترکے کا مستحق صرف دادا ہوگا اس لیے کہ وہ باپ کا قائم مقام ہے اور بھائی محروم رہیں گے جب کہ باقی تینوں مذاہب کے مطابق دادا اور بھائی دونوں وارث ہوں گے۔ کبھی دادا کو باقی بھائیوں کے برابر اور کبھی پورے مال کا تیسرا یا چھٹا دیا جائے گا۔ پہلی رائے حضرت ابوبکرؓ، ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ کی ہے۔ اور دوسری رائے کے قائل حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ ہیں، حضرت عمرؓ کی بھی یہی رائے ہے۔[۱]

اِس ذہنی ہم آہنگی کے باوجود بہت سے مسائل میں دونوں حضرات کا آپس میں اختلاف بھی تھا۔ جیسے حضرت ابن مسعودؓ رکوع میں اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں کے درمیان کر لیتے تھے۔ اور گھٹنوں پر رکھنے سے منع فرماتے تھے۔ جب کہ حضرت عمرؓ کا عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ گھٹنوں کے درمیان ہاتھ رکھنے سے منع فرماتے تھے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو کہے: "اَنْتِ عَلَیَّ حَرَام" (تو مجھ پر حرام ہے) تو ابن مسعودؓ کی رائے کے مطابق یہ قسم ہے جب کہ حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق یہ طلاق ہے۔ اگر کسی شخص نے کسی عورت سے زنا کیا۔ پھر اس سے نکاح کر لیا تو حضرت ابن مسعودؓ کی رائے یہ تھی کہ وہ جب تک ساتھ رہیں زنا کار ہیں، جب کہ حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق پہلے زنا اور بعد کا عمل نکاح شمار ہوگا۔

[۱] الاحکام ۶/۱ [۲] ایضاً

علامہ ابن قیمؒ نے "اعلام الموقعین" میں کہا ہے کہ حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ کے درمیان مختلف فیہ فقہی مسائل کی تعداد سو ہے۔ ان میں سے انہوں نے چار کا ذکر بھی کیا ہے[1] یہ تمام تر اختلافات ان دونوں حضرات کے درمیان موجود باہمی محبت و احترام میں کسی قسم کی کمی کا باعث نہیں بنے۔

ایک بار حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ہاں دو آدمی آئے۔ ان میں سے ایک نے حضرت عمرؓ اور دوسرے نے کسی اور صحابی سے قرآن مجید پڑھا تھا۔ پہلے شخص نے کہا کہ مجھے حضرت عمرؓ نے اسی طرح پڑھایا ہے۔ یہ سن کر ابن مسعودؓ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے جن سے ان کے آگے پڑی ہوئی کنکریاں تک بھیگ گئیں۔ اور فرمایا: "جس طرح عمرؓ نے تمہیں پڑھایا ہے اسی طرح پڑھو۔ بلاشبہ وہ اسلام کا ایک مضبوط قلعہ تھے، جس میں لوگ داخل ہو کر باہر نہیں نکلتے تھے، آپ کے انتقال سے وہ قلعہ ٹوٹ گیا ہے"[2]

حضرت عبداللہ بن مسعود ایک روز آئے اور حضرت عمرؓ تشریف فرما تھے۔ آپ کو آتے دیکھ کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: "یہ تو علم و تفقہ سے بھرے ہوئے برتن کی طرح ہیں"۔ ایک اور روایت میں ہے: "میں علم سے لبریز اس شخصیت کو اہل قادسیہ (عراق) کے لیے منتخب کرتا ہوں"[3] یہ تھا ابن مسعودؓ کے بارے میں حضرت عمرؓ کا نقطۂ نگاہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے اختلافی مسائل انہیں ایک دوسرے کی نگاہ میں اور زیادہ قابل احترام بنا دیتے تھے۔ اس طرح کے واقعات ہمارے لیے اختلافی مسائل کے حل کے لیے رہنما اصول و آداب وضع کرنے میں مشعلِ راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

اختلاف کی چند دیگر مثالیں

صحابہ کرام نے جن آدابِ اختلاف کا مظاہرہ کیا ان کے مزید شواہد کے طور پر چند اور اختلافی مسائل پیش کیے جا رہے ہیں۔

جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور بہت سے دوسرے صحابہ کرام کی طرح حضرت ابن عباسؓ کی رائے یہ تھی کہ باپ کی طرح دادا کی موجودگی میں بھی بھائی بہن وراثت سے محروم ہو جاتے

---

[1] اعلام الموقعین ۲/۲۱۸

[2] الاحکام ۶/۶۱

[3] طبقات ابن سعد ۳/۱۶۱، حیاۃ الصحابہ ۳/۲۵۷

ہیں وجہ سبب کہ حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ اور کچھ دیگر صحابہؓ کے ساتھ حضرت زید بن ثابت کی رائے یہ تھی کہ بھائی دادا کی موجودگی میں وراثت سے حصہ پائیں گے اور دادا انہیں محروم نہیں کر سکتا۔ اس پر حضرت ابن عباسؓ نے ایک روز کہا: کیا زید خدا سے نہیں ڈرتے، پوتے کو تو بیٹے کا قائم مقام بنادیا، مگر دادا کو باپ کا مقام نہیں دیتے'۔ پھر کہا: میں چاہتا ہوں کہ میراث کے اس مسئلے میں جو لوگ مجھ سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ میرے سامنے رکن بیت اللہ پر ہاتھ رکھ کر گڑگڑائیں اور کہیں کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو......[1]

صحابہ کرام کے فقہی اختلافات کے ذکر سے ہمارا مقصود یہ نہیں ہے کہ اختلاف کی بنیادوں کو تقویت پہنچائی جائے یا اختلاف کو ہوا دی جائے بلکہ اس سے مقصد صرف یہ ہے کہ اختلاف کے اصول و آداب کی متاعِ گم گشتہ کو پھر سے ذہن میں تازہ کر کے اس سے اپنے فقہی اختلافات کے حل میں مدد لی جائے۔ اور اپنے معاملات کے لیے اسے اسلوبِ زندگی بنایا جائے۔

حضرت ابن عباسؓ جنہیں اپنے مذکورہ اجتہاد کی اصابت اور حضرت زیدؓ کے اجتہاد کی غلطی پر اتنا وثوق تھا کہ وہ اس پر مباہلہ کرنے کے لیے بھی تیار تھا، ان کی خوبیٔ کردار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک روز انہوں نے زید بن ثابت کو کسی سواری پر تشریف فرما دیکھا تو احتراماً ان کی سواری کی رکاب ہاتھ میں لے لی اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ حضرت زیدؓ نے کہا: اے فرزندِ عمِ رسولؐ آپ ہٹ جائیں اور ایسا نہ کریں۔ ابن عباسؓ نے کہا: ہمیں یہی تعلیم دی گئی ہے کہ اپنے علماء اور بڑوں کے ساتھ ایسا ہی کریں۔ زید بن ثابت نے کہا: لائیں اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائیں حضرت ابن عباسؓ نے ہاتھ آگے کیا تو حضرت زیدؓ نے اسے چوم لیا۔ اور فرمایا: ہمیں نبی کے اہلِ بیت کے ساتھ ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے[2]

جب حضرت زید کا انتقال ہوا تو ابن عباسؓ نے فرمایا: "ھکذا یذھب العلم" علم اسی طرح رخصت ہوتا ہے۔[3] بیہقی کی روایت میں اس موقع پر ابن عباسؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے: "آج علم کا

---

[1] اس حدیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو، المحصول جلد ۲ ق ۲ /۷۶ اور جلد ۲ ق ۱ /۱۸۱

[2] کنز العمال ۷ /۳۷ - حیاۃ الصحابہ ۲ /۲۵۴

[3] اعلام الموقعین ۱ /۱۸

بہت بڑا حصہ دفن ہوگیا"[۱]

صدر اسلام میں بڑے بڑے فتنوں نے سر اٹھایا اور صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلافات رونما ہوئے اور نوبت جنگوں تک پہنچ گئی (جس کے اسباب و وجوہ کا صحیح علم صرف خدا ہی کے پاس ہے) مگر اس عالم میں بھی انہوں نے اہلِ فضیلت کے فضائل کو فراموش نہ کیا۔ اور ان عظیم حادثات اور فتنوں کے باوجود بزرگوں کے مناقب و مآثر ان کی نظروں سے کبھی بھی اوجھل نہ رہے۔

حضرت طلحہؓ جو جنگِ جمل میں شریک تھے، ان کے صاحبزادے عمران بن طلحہؓ جنگ جمل کے بعد حضرت علیؓ کے پاس آئے تو حضرت علیؓ نے انہیں خوش آمدید کہا، انہیں اپنے پاس بٹھایا اور کہا: اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کے والد کو اس جماعت میں سے بنائے گا۔ جن کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: " وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ" (الحجر ۔ ۴۷) (ان کے دلوں میں جو کھوٹ کپٹ ہوگی اُسے ہم نکال دیں گے، وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر (جنت میں) آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے)۔ اس کے بعد حضرت طلحہؓ کے گھر والوں کے بارے میں فرداً فرداً پوچھنے لگے۔ بھتیجے! بچے اور ان کی مائیں کیسی ہیں؟ فلاں کا کیا حال ہے، فلاں کس طرح ہے؟

یہ دیکھ کر کچھ لوگوں کو جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف حاصل نہیں ہو سکا تھا اور ان کے لیے صحابیت کی عظمت و شرف کا اندازہ لگانا مشکل تھا، تعجب ہوا اور کنارے پر بیٹھے ہوئے دو آدمی بول اُٹھے "اللہ انصاف فرمائے۔ کل انہیں سے جنگ کر رہے تھے، اور پھر جنت میں آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ گے؟ اس پر امام علیؓ نے انہیں غصے کی حالت میں کہا: یہاں سے دُور بھاگو، میں اور طلحہ جنت میں اس طرح قریب نہ ہوں گے تو اور کون ہوگا"[۲]

کسی نے حضرت علیؓ سے جنگ جمل میں شریک ہونے والے آپ کے مخالفین کے بارے میں پوچھا: "کیا وہ مشرک ہیں؟ آپ نے فرمایا: شرک سے تو وہ بھاگ کر آئے ہیں۔ اُس نے پھر پوچھا: کیا

---

[۱] سنن البیہقی ۶/۲۱۱۔

[۲] طبقات ابن سعد ۳/۲۲۴ ۔ حیاۃ الصحابہ ۲/۴۶۱

منافق ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ ہمارے بھائی ہیں جنھوں نے ہم سے بغاوت کی۔[1]

جنگِ جمل کے بارے میں حضرت عمار بن یاسر کا موقف اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے برعکس تھا۔ کسی نے ان کے سامنے حضرت عائشہؓ کے بارے میں کوئی نامناسب بات کہی تو آپ غصے میں آگئے اور کہا: چُپ ہو جاؤ، بھونکنے والے گندے آدمی (اسکت مقبوحاً منبوحاً) کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب زوجہ کو تکلیف پہنچانا چاہتے ہو؟ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ جنت میں بھی آپؐ کی زوجہ ہی رہیں گی۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ وہ دنیا و آخرت میں رسول اکرمؐ کی زوجہ رہیں گی۔ اس کے باوجود انھوں نے جو موقف اختیار کیا اس کے ذریعہ دراصل اللہ تعالیٰ ہمارا امتحان لینا چاہتے تھے کہ آیا ہم ان کی اطاعت کرتے ہیں یا خدا تعالیٰ کی۔

ادب و احترام کا اس سے اعلیٰ نمونہ جس کا مظاہرہ ایسے اشخاص نے کیا جن کے درمیان مشیت ایزدی سے آپس میں جنگ و قتال کا معرکہ گرم ہو چکا تھا اور کیا ہو سکتا تھا؟ شمع نبوت سے جو روشنی اُنھوں نے حاصل کی تھی، یہ اُس کا فیض تھا کہ وہ ان کے دلوں کو جگمگاتی رہی اور کینہ کی اندھیریاں ان کے قریب بھی نہ پھٹک سکیں۔

ضرار کی طرف سے حضرت علیؓ کی تعریف اور امیر معاویہؓ کا گریہ و بکا - ایک روز ضرار بن ضمرہ کنانی حضرت معاویہؓ کے پاس آئے تو آپ نے اُن سے حضرت علیؓ کے کچھ اوصاف بیان کرنے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے کہا: امیرالمومنین مجھے معاف رکھیں۔ آپ نے کہا: نہیں، آپ کو ضرور بیان کرنا ہوگا۔ ضرار نے کہا جب کچھ بتانا ضروری ہی ہے تو سنیں:

"بخدا وہ ایک بلند نظر، دُور اندیش اور طاقت ور انسان تھے۔ ان کی بات فیصلہ کُن، اور فیصلہ عادلانہ ہوتا تھا۔ اور اُن کے اطراف و جوانب سے علم و حکمت کے چشمے پھوٹتے تھے۔ آپ دنیا اور اُس کی رنگینیوں سے دُور رہ کر رات کی تاریکیوں سے انس حاصل کرتے تھے۔ بخدا وہ بہت رونے والے تھے۔ اور غور و فکر میں محو رہتے تھے۔ اپنی ہتھیلیاں اُلٹتے پلٹتے تھے اور اپنے آپ سے باتیں کیا کرتے تھے۔ موٹا جھوٹا لباس اور کھانا انھیں پسند تھا۔ بخدا وہ ہمیں جیسے ایک آدمی نظر

---

[1] سنن البیہقی ۸/۱۷۳

آتے تھے۔ اُن کے پاس ہم جب جاتے تو وہ ہمیں قریب رکھتے اور ہماری باتوں کا جواب دیتے، لیکن اتنے قرب وتقرب کے باوجود ان کی ایسی ہیبت تھی کہ ہم اُن سے بات نہیں کر پاتے تھے۔ وہ مُسکراتے تو موتیوں جیسے دانت نظر آتے۔ وہ دینداروں کی تنظیم کرتے۔ اور فقراء و مساکین سے محبت رکھتے۔ کوئی طاقت ور آدمی اُن سے کسی غلط کام کرانے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور کوئی کمزور ان کے عدل سے کبھی مایوس نہ ہوتا تھا۔ میں خدا کو گواہ ٹھہرا کر کہتا ہوں کہ شب کی تاریکیوں میں انہیں بعض مواقع پر میں نے دیکھا کہ محراب کے اندر اپنی ڈاڑھی پکڑے ہوئے اس بے چینی سے تڑپ رہے ہیں کہ جیسے انہیں سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ اور کسی غمزدہ اور ستم رسیدہ شخص کی طرح رو رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس وقت بھی ان کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے اور وہ کہہ رہے ہیں: یا ربنا یا ربنا (اے میرے پروردگار، اے میرے پروردگار) اس کے حضور وہ گریہ وزاری کر رہے ہیں۔ اور دُنیا سے مخاطب ہو کر فرما رہے ہیں: تم میرے پاس آرہی ہو، تم مجھ پر نظریں جما رہی ہو۔ افسوس، افسوس، جاؤ کسی دوسرے کو دھوکا دو، میں نے تمہیں تین طلاق دے دی ہے۔ تمہاری عمر مختصر، تمہاری محفل حقیر، اور تمہاری اہمیت بہت کم ہے۔ آہ، آہ زادِ راہ کتنا قلیل، سفر کتنا طویل اور راستہ کتنا وحشت ناک ...!!

یہ سن کر امیر معاویہؓ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔ آنسو اُن کی ڈاڑھی پر ٹپک پڑے، جسے وہ اپنی آستین سے پونچھتے جاتے تھے۔ روتے روتے حاضرین مجلس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ امیر معاویہؓ نے کہا: بلاشبہ ابوالحسن (حضرت علیؓ) ایسے ہی تھے۔ اللہ اُن پر رحمتیں نازل فرمائے۔ پھر اُنہوں نے پوچھا: ضرار تمہیں ان کا کتنا غم ہے؟ ضرار نے جواب دیا: اتنا جیسے کسی کا کوئی اپنا آدمی خود اُسی کی گود میں ذبح کر دیا جائے، جس سے اس کے آنسو نہ تھمیں اور نہ اُس کا غم سکون پائے۔ یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور چلے گئے۔

۱؎ الحلیہ ۱/۸۴، الاستیعاب ۲/۴۴ - نیز: حیاۃ الصحابہ ۱/۴۷-۴۸۔

دلقص کا ترجمانہ: ایم اختر جاسیب

خلافتِ راشدہ میں آدابِ اختلاف کے نمایاں خدوخال

اختلافی مسائل کا جائزہ لینے وقت یہ بات سامنے آتی ہے کہ اختلافی اُمور میں کسی بھی صحابی کے دل میں نفسانیت کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں ہوتا تھا۔ اور جن اختلافات نے ان اصول و آداب کو جنم دیا ہے، ان کی وجہ بھی حق و راستگی کی تلاش ہی تھی۔ عہدِ رسالت کے بعد آدابِ اختلاف کے چند نقوش یہ ہیں :

۱ — جہاں تک ممکن ہوتا صحابہ کرام اختلاف سے بچنے کی کوشش کرتے۔ اور ان کی یہ شدید کوشش ہوتی کہ اختلاف سرے سے پیدا ہی نہ ہو سکے۔

۲ — جب اختلاف کے معقول اسباب ہوتے (جیسے کسی سنت یا حدیث کے بارے میں معلومات میں کمی بیشی یا کسی نص کے فہم میں اختلاف وغیرہ) تو وہ حدودِ اختلاف سے آگے نہ بڑھتے اور حق بات فوراً قبول کر لیتے تھے۔ اور اپنی غلطی کے اعتراف میں کوئی عار محسوس نہ کرتے۔ صحابہ کرام علم و فضل اور تفقہ کے حامل حضرات کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ اور کوئی اپنے مرتبے سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ ہر ایک کا یہ خیال ہوتا کہ رائے ایک مشترکہ معاملہ ہے، ہو سکتا ہے کہ جو رائے اس نے اختیار کی ہے وہ درست ہو، جس کی وجہ سے وہ اسے ترجیح دیتا ہے البتہ وہ اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کرتا کہ اس کے بھائی کی رائے جسے وہ مرجوح سمجھ رہا ہے، ممکن ہے وہی صحیح ہو۔

۳ — وہ اسلامی اخوت اور بھائی چارے کو جس کے بغیر دین کا قیام ممکن نہیں، اسلام کی اہم بنیاد تصور کرتے تھے۔ اور اُسے اجتہادی مسائل میں اتفاق و اختلاف سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

۴ — اعتقادی مسائل میں اختلاف نہیں ہوا کرتا تھا، اختلاف صرف فروعی مسائل تک محدود رہتا۔

۵ — قراء اور فقہاء کی حیثیت سیاسی قیادت کی طرح نمایاں ہوا کرتی تھی، ہر ایک کا معروف اور غیر متنازعہ مقام و مرتبہ ہوا کرتا تھا۔

٦ — اگر کوئی کسی کی لغزش کی نشان دہی کرتا تو اُسے ایک طرح کا تعاون سمجھا جاتا، نہ کہ عیب جوئی یا بے جا تنقید۔

اسلامی انقلاب اور ہمارے فرائض

لفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) ڈاکٹر غلام فرید بھٹی صاحب

تعارف یہ ملک اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسی جگہ مہیا کردی جائے جہاں وہ پوری آزادی سے اپنے عقائد اور نظریات کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ اس ملک میں ایک ایسی حکومت قائم ہو جو ایسے حالات پیدا کرے جو مسلمانوں کے لیے اپنی زندگیاں اسلامی نظامِ حیات کے مطابق ڈھالنے میں مدد دے سکیں۔ اگرچہ اس ملک کو بنے ہوئے چالیس سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے، لیکن یہاں کے باشندوں کی یہ توقعات ابھی تک پوری نہیں ہوسکیں۔

اس ملک میں یہ اسلامی یا مثبت تبدیلی کس طرح پیدا کی جائے؟ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پیش خدمت ہیں:

۱۔ اسلام کے بنیادی عقائد اسلام کا سارا دارومدار توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدہ پر ہے۔ اِن تین چیزوں میں شک پیدا ہو جانے کے بعد کوئی شخص اسلامی تہذیب کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں رہ سکتا۔ سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے جن نوجوانوں میں کوئی اسلامی شعور موجود ہے وہ اپنی درس گاہوں میں الحاد، دہریت اور تشکیک پیدا کرنے والی ہر تحریک کا مقابلہ کریں۔ کسی ایسی تحریک کو قدم نہ جمانے دیں جو ان بنیادی عقیدوں سے منحرف کرنے والی ہو۔

یہ زمین خدا کی ہے۔ ہوا، پانی، روشنی اور ہر وہ شے جس پر ہم زندگی بسر کرتے ہیں، سب کچھ خدا کا ہے۔ یہ جسم جو ہمیں حاصل ہے اور اس کے اندر جو طاقتیں ہیں، سب خدا کی بخشی ہوئی ہیں۔ ملک بھی

اللہ تعالیٰ کا ہے، اس لیے حکم بھی اللہ تعالیٰ کا ہی ہوگا۔ اس کے سوا کسی کو انسانوں کے لیے خدا کے قانون کے منافی کوئی دوسرا قانون بنانے کا حق نہیں ہے۔ انسان کا خالق اللہ ہے، وہی انسانی نفسیات اور ضروریات کو سب سے زیادہ سمجھتا ہے۔ اس لیے انسان کے لیے قانون بنانے کے لیے وہی سب سے بہتر قانون بنانے والا ہے۔ اور اُسی کو اس کا صحیح حق پہنچتا ہے۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو براہِ راست قانون نہیں دیتا، بلکہ اپنے رسولوں کے ذریعے دیتا ہے۔ ہمارے رسول اکرمؐ کسی انسان کے منتخب کیے ہوئے حکمران نہیں تھے۔ نہ وہ خود اپنے آپ حکمران بن گئے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اِس منصب پر مقرر فرمایا تھا کہ آپؐ لوگوں کو تعلیم بھی دیں اور ان کی تربیت بھی کریں۔ اُن کے ذہن و فکر اور اخلاق بھی ٹھیک کریں۔ اور جو لوگ خدا کے احکام کو قبول کر کے اُن کے برحق ہونے پر ایمان لاتے ہوں، اُن کے ذریعے سے احکاماتِ الٰہی کو نافذ بھی کریں۔ اِس لیے منصب رسالت اور احکاماتِ رسالت پر ایمان لانا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود اللہ کی موجودگی اور اس کی صفات و احکامات پر ایمان لانا ضروری ہے۔

اگر انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ نہ سمجھے اور اس کو یہ یقین نہ ہو کہ ایک دن اسے مرکر اپنے خدا کے سامنے جانا ہے اور اپنے تمام اعمال کا جواب دینا ہے تو وہ نہ اسلام کے راستہ پر چل سکتا ہے اور نہ حقیقت میں صحیح انسان بن سکتا ہے۔

یہ تین عقائد ایک مسلمان کی زندگی میں ایک بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اِن عقائد پر پختہ یقین کیے بغیر اسلامی انقلاب کی منزل کی طرف ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اور نہ ہی ان عقائد کے بغیر ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے برتاؤ میں کوئی مثبت تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے۔

۲۔ علمِ دین سے واقفیت ہمارے نوجوان طلبا اور تحریکِ اسلامی کے تمام کارکنوں کو اس بات کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ اُن کو دینِ اسلام سے واقف کرانے کے معاملے میں جو کچھ بھی کوتاہی ہمارے نظامِ تعلیم میں کی گئی ہے اس کی تلافی وہ اپنی کوششوں سے کریں۔ آپ کی اپنی زبان میں جو اسلامی لٹریچر موجود ہے، اُس کا مطالعہ کیجیے۔ اور کم از کم اتنا ضرور جان لیجیے کہ مسلمان اور کافر میں کیا فرق ہے؟ مسلمان کے لیے کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے، اس کے فرائض کیا ہیں۔ اُس کے لیے اخلاق کے کیا اصول ہیں، معاشرے میں اس کا کیا مقام اور اُس کی کیا ذمہ داری ہے۔ ایک مسلمان کے لیے علم دین حاصل

کرنا کیوں ضروری ہے۔ ان بنیادی امور کو جانے بغیر تحریکِ اسلامی کا کوئی کارکن اپنے فرائض ادا نہیں کر سکتا۔

۳۔ علمِ دین دوسروں تک پہنچائیں — ایک مسلمان کے لیے علمِ دین حاصل کرنا ہی کافی نہیں، اُسے دوسروں تک پہنچانا بھی ضروری ہے۔ لمبی لمبی ڈاڑھیاں رکھ کر، لمبے لمبے چوغے پہن کر، سر پر اسلامی وضع قطع کی ٹوپیاں پہن کر گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر کے اسلامی انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ اِس کے لیے خون پسینہ ایک کرنا ہوگا۔ جب دوسرے سو رہے ہوں گے آپ کو جاگنا ہوگا۔ طعنے سننے ہوں گے، تنقید برداشت کرنا ہوگی۔ اور ہر ممکن ذریعۂ ابلاغ کو استعمال کرتے ہوئے علمِ دین کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا ہوگا۔

ذاتی ملاقاتیں، جمعہ کے وعظ، لٹریچر، ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار، رسالے، کتب اور ٹیپ ریکارڈر، غرض ہر جدید ذریعۂ اظہار کی مدد سے علمِ دین کی شعاعوں کو زیادہ سے زیادہ پھیلانا اور ایوانِ زندگی کے گوشوں اور کونوں تک کو منور کرنا ہوگا۔ اپنی ذات سے باہر نکل کر آپ کا اپنا گھر، آپ کا خاندان، آپ کے عزیز و اقارب، آپ کے دوست احباب، آپ کا محلہ، آپ کا شہر، آپ کا ملک اور پوری دنیا کتنے میدان ہائے کار ہیں: جو آپ کے کام کا انتظار کر رہے ہیں۔

۴۔ علمِ دین کو عملی زندگی میں نافذ کریں — علمِ دین حاصل کرنا اور اس علم کو دوسروں تک پہنچانا تو اہم ہے ہی لیکن اس علم کو عملی طور پر بروئے کار لانا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ کوئی علم اس وقت تک اپنے اثرات مرتب نہیں کرتا، جب تک اس علم کے اُصولوں کو ہم اپنی عملی زندگیوں میں نافذ نہ کریں۔ کوئی نظامِ حکومت خواہ کتنے ہی اعلیٰ مرتبے کا ہو اور اس کے قوانین خواہ کتنے ہی بہترین کیوں نہ ہوں، اگر اس کی عمارت اخلاق کی مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو، اگر اس کے چلانے والے بلند سیرت و کردار کے مالک نہ ہوں، اگر معاشرہ ایماندار اور خدا ترس نہ ہو تو وہ کبھی کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ جس چیز کا نام اسلامی نظام ہے، وہ کسی بے ایمان، منافق اور بدکردار حکومت کے ہاتھوں سے نہیں چل سکتا — خدا کے خوف سے عاری سرکاری ملازمین کی مشینری اسے نہیں چلا سکتی۔

اس لیے بڑا ضروری ہے کہ ہماری درس گاہیں اور سرکاری ملازمین کو تربیت دینے والے ادارے کسی ایسے نظام کے تحت چل رہے ہوں جو نہ صرف تکنیکی اعتبار سے اچھے ملازمین پیدا کریں بلکہ نظریاتی لحاظ

سے اچھے مسلمان بھی تیار کریں۔

حکومتی سطح کے علاوہ ہم اپنے گھروں میں، نجی کاروبار میں، اور روزمرہ لین دین میں، اور تمام سماجی رابطوں اور رشتوں میں اسلامی اصولوں کو عملی جامہ پہنا کر عوام الناس کو اسلام سے روشناس کرائیں۔ اسلامی انقلاب لانے کے لیے حکومت اور عوام دونوں کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک عمل کریں۔

کسی قوم کی نئی نسل اگر اپنا قومی تشخص کھو دے ... اور کوئی دوسرا تشخص اس پر مسلط ہو جائے یا وہ خود شوق سے اختیار کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قوم ختم ہو گئی۔ کیونکہ قوم محض انسانی جسموں کا نام نہیں ہے، بلکہ انسانوں کی تہذیب و تمدن، ان کے سوچنے کے انداز، ان کے اخلاق کے نمونوں اور ان کے اچھے یا برے اعمال کے مجموعے کا نام ہے۔

۵۔ تہذیبی میراث کو آئندہ نسلوں تک منتقل کریں

یہ زمین جسے آج ہم پاکستان کہتے ہیں، ہمارے بزرگوں نے اس غرض کے لیے حاصل کی تھی کہ یہاں اسلامی تہذیب جلوہ گر ہو۔ اور ہم جس نظام زندگی کے قائل ہیں اس کو یہاں عمل میں لایا جا سکے، تاکہ آئندہ نسلیں اس رنگ میں رنگی جائیں۔ اور ان کو ہم انھی اصولوں کے مطابق تیار کر کے جائیں۔ اس ملک میں مسلمان قوم اسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس قابل ہو کہ وہ اس تہذیبی میراث کو منتقل کر سکے۔ اور پھر نسل در نسل اس کے منتقل ہونے کا سلسلہ چلتا رہے۔ اگر ہم ان امتیازی خصوصیات کو باقی نہ رکھ سکیں اور ہماری نئی نسل اسلامی تہذیب کے بجائے کسی اور رنگ میں رنگی جائے تو آئندہ پاکستان میں مسلمان قوم نہیں، بلکہ کوئی اور قوم آباد ہو گی۔

یہ محض تعلیم کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہمارے قومی وجود اور اس کی بقا کا مسئلہ ہے۔ ہم یہاں ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے اسی طرح زندہ اور باقی رہ سکتے ہیں جب ہماری نوجوان نسل جو درس گاہوں میں تیار ہو رہی ہے۔ ٹھیک ٹھیک اسلامی تہذیب کی حامل ہو۔ اور اس کی علم بردار بن کر اس سرزمین میں رہے۔

۶۔ اسلامی حکومت

ہمارا ملک ایک نظریاتی ملک ہے، لہٰذا اس کی حکومت کا بھی نظریاتی ہونا نہایت ضروری ہے۔ طاقت اور دولت حکومت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ قانون حکومت بناتی ہے۔ پولیس اور فوج کی قوت حکومت کے پاس ہوتی ہے۔ ذرائع ابلاغ حکومت کے قبضے میں ہوتے ہیں۔

حکومت کے اختیارات جن لوگوں کے ہاتھ میں ہوں گے ۔ ان کے ذہن اور فکر جس قسم کے ہوں گے، اُن کے بنائے ہوئے اُصول و قوانین اور پالیسیوں کے خطوط بھی اسی فکر کے مظہر ہوں گے ۔

حکومت کے بیارہ باب اختیار انہی قوتوں کے مددگار ہوں گے جو اُن کے فکر اور خیالات کے مطابق ہوں گی انہی کی وہ پشت پناہی کریں گے اور انہی کے وہ سرپرست اعلیٰ بنیں گے ۔ حکومت کی سرپرستی اور مدد کے بغیر معاشرے میں کسی کام کا آسانی سے ہونا ممکن نہیں ہے ۔ اس کی عدالتیں، اس کی انتظامیہ، اس کی قانون ساز اسمبلیاں، اس کی پولیس، اس کی فوج اور اس کی سرکاری مشینری، اُن قواعد و ضوابط کی پابند ہو گی جو حکومت ان اداروں کے چلانے کے لیے بنائے گی ۔

طاقت جن ہاتھوں میں ہے اگر وہ خراب ہیں تو وہ خود بھی ظلم کریں گے اور ظالموں کا ساتھ بھی دیں گے۔ اصلاحِ معاشرہ کے کام کے لیے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ حکومت نیک اور پرہیزگار لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ شراب، جوا، زنا، سود، رشوت، فحش تماشے، بے حیائی کے لباس، عریاں اور نیم عریاں عورتوں کی تصاویر، بد اخلاق بنانے والی تعلیم و تربیت اور ایسی ہی بہت سی دوسری معاشرتی برائیاں محض وعظ و نصیحت کی نسبت حکومت کے احکامات سے زیادہ آسانی سے دُور کی جا سکتی ہیں ۔

اس ملک میں اسلامی حکومت کس طرح قائم کی جائے؟ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے ۔ میری رائے میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنے نظامِ تعلیم، سرکاری ملازمین منتخب کرنے والے اداروں سرکاری ملازمین کی تربیت کرنے والے اداروں، ملکی ذرائع ابلاغ اور عوام الناس کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے ۔

۷ — **نظامِ تعلیم** | کسی ملک کا نظامِ تعلیم ایک ایسا سانچہ ہے جس میں نسلوں کو ڈھالا جاتا ہے ۔ نظامِ تعلیم ہمیشہ قومی اُمنگوں کا مظہر ہوتا ہے ۔ ایک منظم نظامِ تعلیم نہ صرف اس بات کو واضح کرتا ہے کہ معاشرہ میں کس قسم کے انسان درکار ہیں، بلکہ وہ ایسے انسان پیدا بھی کرتا ہے ۔

ایسے نظامِ تعلیم میں طلبا، اساتذہ، درسی کتب اور ذرائع ابلاغ سب ایک ہی مقصد کی تکمیل کے لیے کام کرتے ہیں ۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے ۔ اس کے باشندوں کو ایک خاص رواج اور ایک خاص طرزِ فکر درکار ہے ۔ ہمارے نظامِ تعلیم کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ ایسے شہری تیار کرے جو حکومت کے ہر شعبے میں اس مملکت کے نظریاتی تقاضوں کو پورا کر سکیں ۔

ہمارے نظامِ تعلیم کا بنیادی نقص یہ ہے کہ جن ایمانیات اور جن عقائد پر ہماری تہذیب اور ہمارے اخلاق کی ساری بنیاد قائم ہے، یہ تعلیم ان کو تقویت پہنچانے کے بجائے اُلٹا اُن کو کمزور کرتی ہے۔ بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے کہ جو اپنے یقین کی چولیں ڈھیلی کیے بغیر اس تعلیم سے فارغ ہو کر بخیریت باہر نکل آتے ہوں۔

جس شخص کے اندر اپنی ذات سے بالاتر کسی چیز کی وفاداری باقی نہ رہی ہو، اُسے آپ کس طرح ذاتی مفاد کی قربانی پر آمادہ کر سکتے ہیں؟ یہ قصور درسی کتب، اساتذہ اور تعلیمی ماحول سب کا ہے۔ انگریزوں نے یہاں ایسا نظام قائم کیا جو ہمارے ایمان کو کمزور کرنے والا، ہمارے عقائد کو مشکوک بنانے والا اور ہماری نگاہوں سے خود اپنی تہذیب کو گرا دینے والا تھا۔ ان کا سیاسی مفاد ہی اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ ہمیں اسلام سے جس حد تک منحرف کرا سکتے ہوں، کریں۔ لیکن اب پاکستان بننے کے بعد اِس لادینی نظامِ تعلیم میں تبدیلی آنی چاہیے۔

ہمیں اپنی درسی کتب خود لکھنی چاہئیں، اپنے نظامِ تعلیم میں ہمیں اپنے نظریاتی پہلوؤں کو نمایاں کرنا چاہیے۔ ہمیں ایسے اساتذہ منتخب کرنے چاہئیں جو اسلام کی محبت سے بھی سرشار ہوں اور پوری پیشہ وارانہ مہارت بھی رکھتے ہوں۔ ہم مغرب کی جدید علمی ترقی سے بھی استفادہ کریں، لیکن مغرب کے لادینی نظامِ تعلیم کے نقصانات کو بھی نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ مغربی علوم اور کتب سے استفادہ کرتے وقت ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اگر ہم مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان تمام علوم کو مسلمان بنا کر پڑھانا ہوگا۔ ورنہ یہ علوم ہمیں مسلمان نہ رہنے دیں گے۔ یہ ہماری تعلیم کا بنیادی مسئلہ ہے اس کو ہم جتنا جلدی سمجھ جائیں ہمارے لیے اتنا ہی بہتر ہے۔

ہماری درس گاہوں میں آج ایسے اساتذہ موجود ہیں جو دن رات طلبہ کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں یہ عقیدہ بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام کی کوئی تہذیب نہیں ہے۔ اسلام کا کوئی سیاسی، معاشی یا معاشرتی نظام نہیں ہے۔ اسلام کے اگر کچھ اُصول ہیں بھی تو وہ اس زمانے میں نہیں چل سکتے۔ تاریخ میں مسلمانوں کا کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہیں ہے جتنے بھی ہیرو ہو گذرے ہیں وہ سب غیر مسلم تھے۔

یہ مسلمان طلبہ کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔ اِن گمراہ کن خیالات کا جواب دینا نہایت ضروری ہے۔ اِس

کے لیے اپنے دین، اپنی روایات، اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے، تاکہ ہمارے مسلمان طلبہ اپنی روایات اور ماضی کے سنہری کارناموں سے واقفیت پیدا کرکے ان الزامات کو جھوٹا ثابت کرسکیں۔

یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم لوگ مسلمانوں کو احساسِ کمتری سے نکال سکتے ہیں اور ان میں ایک دفعہ پھر خود اعتمادی پیدا کرسکتے ہیں۔ انہیں اپنی روایات اور تہذیب سے محبت کرنا سکھا سکتے ہیں۔

۸۔ سرکاری ملازمین حکومت کی مشینری چلانے میں سرکاری ملازمین کو ایک انتہائی اہم حیثیت حاصل ہے۔ سرکاری ملازمین کا اصل ذہن اور فکر تو تعلیمی درس گاہوں میں ہی بن جاتا ہے۔ ان درس گاہوں میں درسی کتب اور اُستاد اُن کا ذہن بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تعلیمی ادارے کا عمومی ماحول، مخلوط تعلیم کا ہونا یا نہ ہونا، یہ سب چیزیں طالب علم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ خصوصاً اعلیٰ طبقوں کے وہ طلبا جو کسی مشنری یا خالص فرنگی طرز کے ادارۂ تعلیم و تربیت سے گزرتے ہیں، ان کی پوری شخصیت دگرگوں ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد سرکاری ملازمت کے لیے انتخاب کا نظام، منتخب کرنے والے افراد، مقابلہ کے امتحان میں تعلیمی مواد کا سلیبس، یہ ساری چیزیں سرکاری ملازم کی تربیت کا آغاز کر دیتی ہیں۔ ملازم ہونے کے بعد سرکاری ملازمین کے مخصوص ادارے، ان کا ماحول، ان میں پڑھانے والے اساتذہ، ان اداروں میں پڑھائی جانے والی درسی کتب، سب مل کر سرکاری ملازمین کی تعلیم و تربیت میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

پھر جب ملازمین، خصوصاً افسر لوگ دفتری ماحول میں داخل ہوتے ہیں تو بیوروکریسی کے پیدا کردہ طرح طرح کے لوگ ان کو چمٹ جاتے ہیں جن کے جراثیم فضا میں پھیلے ہوتے ہیں اور دماغوں کو دماغوں سے چھوت بھی لگتی ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے سرکاری ملازمین ذہن اور فکر کے لحاظ سے پکے مسلمان ہوں جو اس مملکت کی نظریاتی ضروریات کو پورا کرسکیں تو ہمیں مندرجہ بالا سرکاری ملازمین سے متعلق تمام عوامل کا مکمل جائزہ لینا چاہیے۔ اور ان عوامل کو سب سے پہلے مسلمان بنانے یا ماحول سے خارج کرنے کے لیے عملی اقدامات کرنے چاہئیں۔ اسلام ناآشنا اداروں سے مسلمان تیار ہونے کی توقع کرنا ایک غیر فطری اور غیر عقلمندانہ توقع ہے۔ (باقی)

آج کل کے دانشور

ترجمہ: جناب فیض احمد شہابی صاحب

پچھلے دوسو سالوں میں دانشوروں کی ایک نئی کھیپ سامنے آئی ہے، وہ نام نہاد مذہبی اجارہ داروں، وقائع نگاروں اور واعظوں کے روپ میں ظاہر ہوئے ہیں۔ والٹیئر اور روسو کے عہد میں جو لادین دانشور اٹھے، وہ اپنے فکری گھمنڈ میں سب سے سبقت لے گئے۔ منفی سوچ کے اس رجحان نے بعد میں خطرناک صورتِ حال پیدا کر دی۔ اندازہ خود لگا لیجیے کہ مشہور شاعر شیلے نے ۱۸۲۱ء میں شاعروں کے بارے میں کہا کہ یہ دنیا کے "غیر منتخب قانون ساز" ہیں۔ دانشوروں اور روشن خیالوں کا طبقہ آج بھی اسی انانیت کا شکار ہے۔ نامور فلاسفر لیونل ٹرلنگ نے صاف صاف لفظوں میں کہا ہے کہ موجودہ دور کی دانشوری مخصوص سیاسی غلبے سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ دانشوروں کا طاقت میں ساجھی ہونے کا رجحان تاریخ میں پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔

انسانیت سے ہمدردی کا اظہار کرنے والے دو گروہ ہر مقام پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو کسی نہ کسی انداز میں عملی طور پر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے گروہ میں ایسے افراد ہیں جنہیں صرف اپنے نظریے سے غرض ہے۔ پہلے گروہ میں ایسے اہلِ سیاست شامل ہیں جو انتخابات کے معروف طریقوں سے عنانِ حکومت سنبھالتے ہیں۔ دوسرا گروہ ان دانشوروں کا ہے جو ہر وقت اقتدار کی حسرت لیے پھرتے ہیں۔ انہیں کرسی مل جائے تو پھر اپنے نظریے کی صداقت جتانے کے لیے طاقت کا غلط استعمال کرنے سے نہیں چوکتے۔ وہ پورے معاشرے کو اپنے

نظریے کی تجربہ گاہ بنا دیتے ہیں۔ مخصوص طرزِ عمل کے باعث افراد کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ان کی پسند و ناپسند پسِ پشت ڈال دی جاتی ہے۔ جب افراد اپنے حقوق کے لیے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں معاشرے کا دشمن کہہ کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔ دانشور ڈبلیو ایچ آڈن کے نزدیک ناپسندیدہ عناصر کا صفایا ایک ناگزیر عمل ہے۔ وہ اسے "جبری قتل" کا نام دیتا ہے — لینن کی اصطلاح میں اسے "طبقاتی دشمنوں کا خاتمہ" اور نازیوں کے الفاظ میں اسے "آخری حل" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دانشوروں میں معاشرے کی "خدمت" کا سودا سماتا ہے تو وہ خود غرض اور خود پسند ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر اُس شخص سے نفرت کرتے ہیں جو ان کی طرزِ فکر میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ دانشوروں کی عملی زندگی تضادات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ان کی کھوکھلی فکر کبھی برگ و بار نہیں لاتی۔ جب سے سیاسی نظریات میں لادینیت کا عنصر داخل ہوا ہے، فکر و عمل کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے دانشور اپنے نظریات کا تازیانہ آزمانے کے لیے اور بھی بے تاب ہو گئے ہیں۔ اصل میں انسانیت کے یہ خادم ایسے چابک دست استحصالی ہیں جو اپنے نظریات اپنی ذات پر نافذ نہیں کرتے۔ اینگلو سیکسن شاعر شیلے کی زندگی پر نگاہ ڈالیے۔ وہ اپنی شاعری میں معاشرے کے دُکھوں کا رونا روتا ہے — مظلوم کو دیکھ کر کلبلا اُٹھتا ہے، لیکن نجی زندگی میں اس کا دل رحم و شفقت سے قطعی عاری نظر آتا ہے۔ شیلے کی روشن مشعل نے سب سے پہلے اپنے گھر کا سکون خاکستر کیا۔ اس کی بدسلوکی اور بے وفائی سے تنگ آکر اس کی پہلی بیوی ہیریٹ اور محبوبہ فینی گاڈون نے خودکشی کر لی۔ شیلے کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی پہلی بیوی سے کس حد تک اُکتا چکا تھا۔ اس نے ایک اور لڑکی میری سے شادی کی لیکن اُسے سکون کی دولت پھر بھی نہ مل سکی۔ میری بعد میں نہاتے ہوئے پُراسرار طور پر ڈوب کر ہلاک ہو گئی۔ انگلینڈ سے باہر نیپلز میں وہ اپنی ایک ناجائز لڑکی چھوڑ آیا تھا۔ جہاں وہ کس مپرسی کی حالت میں دم توڑ گئی۔ شیلے کا ایک لڑکا انگلینڈ کی مقامی عدالت میں محافظ کے عہدے پر فائز تھا۔ لیکن باپ نے اس سے ملنا کبھی گوارا نہیں کیا۔ شیلے نے ایک اسکول کی استانی الزبتھ ہیکنز سے محبت کی پینگیں بڑھائیں اور پھر اس کی عزت لُوٹ کر اس کی زندگی تباہ کر دی۔ اس نے مذکورہ استانی سے ایک بار سو پونڈ ادھار لیے اور پھر کبھی واپس نہ کیے۔ شیلے اپنے نوکروں سے نہایت ہتک آمیز

طریقے سے پیش آتا۔ چند خوش قسمت اس سے اپنا معاوضہ وصول کرنے میں کامیاب ہوتے۔ شیلے نے اپنے کیے پر کبھی اظہارِ ندامت نہیں کیا۔ اُلٹا وہ اپنے "کارناموں" پر فخر محسوس کرتا تھا۔ ایک بار اس کے ایک دوست نے اس کی بے وفائی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اسے اپنی بیوی کو نظرانداز کر کے دوسری عورتوں کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے۔ شیلے نے جواب دیا "دوستی نبھانا میرا حق ہے میں انسانیت، راستی اور دیانت کا پرستار ہوں"۔

شیلے نے جو کارنامے انجام دیے ان سے اس کی دو رُخی کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

اشتراکی دانشور کارل مارکس کی ابتدائی تحریریں منظرِ عام پر آئیں تو پتہ چلا کہ وہ جبر و تشدد اور قتل و غارت کے ذریعے معاشرے کی چھانٹی چاہتا ہے۔ اس کے باپ نے اُسے خط لکھا "تمھاری تحریریں ہلاکت خیز ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ تمھارے دل میں خودغرضی کے سوا کچھ نہیں"۔ مارکس کی ماں اُسے عاقبت نااندیش کہہ کر پکارتی۔ وہ اپنے بیٹے کے باربار کے تقاضوں سے تنگ تھی۔ اس کے باوجود مارکس کے پاس روپے پیسے کی کمی کبھی نہ رہی۔ وہ کہیں نہ کہیں سے اپنی جیب بھری رکھتا۔ کم از کم دو خدمت گار تو ہر وقت اس کے پاس موجود رہتے۔ وہ اپنے نجی انتظام کو خالص بورژوائی حیثیت کا نام دیتا۔ مارکس کی تین بیٹیاں تھیں۔ انھیں پیانو بجانے کے علاوہ کوئی تعلیم نہ دلوائی۔ مارکس کو ایک بار رقم کی ضرورت پڑی تو اس نے بیوی کے کپڑے اور چاندی کے زیور تک بیچ کھائے۔ وہ اخلاقی طور پر ایک پست کردار شخص تھا۔ گھر کی ایک نوکرانی سے اس کے ناجائز تعلقات تھے۔ بعد میں اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو اس نے خفت مٹانے کے لیے اُسے اپنے ایک دوست فریڈرک اینجلز کے حوالے کر دیا۔ مارکس کی بیٹی ایلینور نے ایک بار باپ کو خط لکھا "یہ حیرت کی بات ہے کہ آپ نے حقائق کا سامنا کبھی نہیں کیا۔ آپ نے دل لبھانے والے تصورات تو پیش کیے مگر ان پر خود عمل کرنے میں ناکام رہے۔ کیا یہ اصولوں سے انحراف نہیں ہے"۔ دل برداشتہ ایلینور نے بعد میں خودکشی کر لی۔

مارکس کو افراد کی خوشیوں یا اداسیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ عام انسان کے تقاضے کیا ہیں۔ اور وہ کسی پہلو سے سوچتا ہے۔ مارکس نے کبھی کسی پرولتاری سے مل کر دریافت نہیں کیا کہ اس کے حقیقی مسائل کیا ہیں اور انھیں کیسے حل کیا جاسکتا ہے۔

محنت کشوں کے اس دردمند نے زندگی میں کسی فیکٹری کے اندر قدم تک نہ رکھا۔ ایک بار اینجلز نے اسے ایک فیکٹری میں لے جانے کی پیش کش کی، جو اس نے ٹھکرا دی۔ اس کے برعکس مارکس کی اپنے سرمایہ دار چچا سے اکثر ملاقات رہتی تھی جو ہالینڈ میں مقیم تھا۔

اسی طرح لینن کی زندگی پر نگاہ ڈالیے۔ سوویت یونین کا آمر مطلق بننے سے پہلے اس نے بھی کسی فیکٹری کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک کتابی سوشلسٹ (LIBRARY SOCIALIST) تھا۔ مزدوروں یا کسانوں سے اس نے کبھی حقیقی تعلقات پیدا نہیں کیے تھے۔ لینن کے بعد زمام اقتدار اسٹالن کے ہاتھ آئی۔ اس خونخوار نے اشتراکیت کے نام پر جو تباہی مچائی، وہ محتاج بیان نہیں۔ مغربی معاشرے میں ذہنی لبگاڑ پیدا کرنے میں سگمنڈ فرائیڈ کا بڑا ہاتھ تھا۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی اس کے نظریات سے کافی متاثر تھے۔ علم النفس کی انوکھی تشریح کرنے والا فرائیڈ تحکمانہ طور طریقے سے زندگی بسر کرنے کا قائل تھا۔ گھر میں اس کی بیوی کی حیثیت خادمہ جیسی تھی۔ وہ اپنے نظریات کے بارے میں بحث مباحثے سے کتراتا تھا۔ ایڈلر اور جونگ جیسے ماہر نفسیات ابتدا میں فرائیڈ کے خاص چیلے تھے۔ انھوں نے بعد میں فرائیڈ کے نظریات سے اختلاف کیا اور اس کے حلقۂ فکر سے باہر آگئے۔ فرائیڈ ان کے نکلنے سے اتنا برہم ہوا کہ انھیں دنیا بھر کی گالیاں دے ڈالیں۔ دغاباز، بدعتی، پاگل اور نجانے کیا کچھ کہا۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ نام نہاد ترقی پسند دانشور صبر و تحمل سے قطعی عاری ہوتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو ان سے اتفاق نہیں کرتا، ان کی نگاہ میں قابلِ نفرت ٹھیرتا ہے۔

دانشوروں کے اشتراکی ہونے کی کئی وجوہ ہیں۔ خاص وجہ وہ لالچ ہے جو خواہشات و مفادات کی تکمیل چاہتا ہے۔ ہوائے نفس کے لیے طاقت کو ہاتھ میں لینے کا جنون ہلاکت خیز نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ جرم ہے جسے انسانیت معاف نہیں کر سکتی۔ دانشور بائیں بازو میں شمولیت اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ اسی پلیٹ فارم پر انھیں اپنے عزائم پورے ہوتے نظر آتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے جبکہ اشتراکیت اپنی پوری قوت سے معاشرے پر حملہ آور ہوتی ہے۔ دانشور اس میں ہراول دستے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ یہ لوگ فرائیڈ یا مارکس کی طرح قلم سنبھالے مجرد فکر میں گم ہو۔ اب وہ کھلم کھلا تشدد کا

بیچارک ہے ۔ اس کی ہمدردیاں مظلوموں کے بجائے آمروں اور جابروں کے ساتھ ہیں ۔ وہ اسٹالن، ماؤزے تنگ، کاسترو اور ہوچی منہ کا ثناخوان ہے، جنہوں نے خود کو اشتراکیت کی گدی پر بٹھانے کے لیے لاکھوں انسان بھینٹ چڑھا دیئے ۔ ماؤزے تنگ کے عہد میں تیس لاکھ انسانوں کا خون بہا۔ ایک دفعہ نیو سٹیٹسمین میں چین کے اسی آمر مطلق کی ہلاکت خیزیوں کے بارے میں روداد چھپی ۔ چند دن بعد اخبار کے ایڈیٹر کو معروف دانشور لیونارڈ ولف کی طرف سے خط ملا ۔ تحریر تھا ۔

"کیا ایڈیٹر صاحب اپنے پڑھنے والوں کو بتا سکتے ہیں کہ اس انقلاب کے لیے زیادہ سے زیادہ کتنے لوگوں کو ہلاک کرنا ضروری تھا؟"

موجودہ دور میں ہر خونریزی کے پیچھے کسی نہ کسی دانشور کا ہاتھ نظر آتا ہے ۔ وہ چیکا اور کے جی بی جیسی آفت انگیز تنظیموں کے مداح ہیں ۔ ایک زمانے میں وہ نازیوں کے پرستار تھے ۔ اب وہ قاتل اشتراکی تحریکوں کے مؤید ہیں ۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں ان کے انقلابیوں نے کمبوچیا کی ایک تہائی آبادی تہ تیغ کر دی ۔ اس وقت جین پال سارتر اور مارکس کی ذریت لاشوں پہ انقلابی ترانے گا رہی تھی ۔ اشتراکی آمریت اور تخریب کاری کی راہ ہموار کرنے کے لیے دانشور آگے آگے نظر آتے ہیں ۔ وہ ایسے خونخوار ہیں جن کی نگاہ میں انسانی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان روڑے پتھر ہیں، جنہیں اشتراکیت کی دیوار میں چنا جا سکتا ہے ۔

اشتراکیت، دنیا کے لیے خطرے کی سب سے بڑی علامت ہے ۔ "دانشوروں" سے خبردار رہیے ۔ ان کی کمیٹیوں، مشاورتی جلسوں اور حلقوں سے خود کو دور رکھیے ۔ ان کا ہر اجتماع کوئی نہ کوئی بحران پیدا کرنے کے لیے ہوتا ہے ۔ وہ نامعقول طریقوں سے لوگوں کو تشدد اور لاقانونیت پہ ابھارتے ہیں ۔ یاد رکھیے کہ نام نہاد نظریات سے انسانی جانیں زیادہ قیمتی ہیں ۔

پال جانسن ۔ بشکریہ "دی الیٹین وال سٹریٹ جرنل"

رسائل و مسائل

ٹی وی اور اسلام

ادارہ

سوال:- کچھ عرصے سے ٹی وی پر موسیقی کے پروگرام اس کثرت سے پیش کیے جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کو کوئی غم نہیں، کوئی مسئلہ نہیں، جب کہ ملک کی حالت یہ ہے کہ کراچی میں انسان گاجر مولی کی طرح کاٹے جا رہے ہیں (یہ خط غالباً ۳۰ مارچ کا لکھا ہوا ہے۔ مدیر)، پشاور میں روز دھماکے ہو رہے ہیں۔ روس اور بھارت سرحدوں پر کھڑے دستک دے رہے ہیں۔

اسلام میں، ہم سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ موسیقی اور گانا بجانا قطعی طور پر حرام ہے۔ کیا اس کی دعویٰ دار حکومت کو یہ زیب دیتا ہے کہ اس کے ٹی وی پر اللہ کے قانون کا اس طرح مذاق بنایا جائے (صحیح: اُڑایا جائے)۔ موسیقی کی طرف راغب کرنے کا یہ عالم ہے کہ کبھی اسے رُوح کی غذا کہا جاتا ہے۔ (جی ہاں، جس معاشرہ نبویؐ میں روح کے لیے اس غذا کا سامان نہ تھا، وہاں تو انسانوں کی روحیں زندگی ہی میں سسک سسک کر مر جاتی ہوں گی۔ مدیر)۔ اور روزانہ باقاعدگی سے ایک دو خاص پروگرام اس کے لیے ہوتے ہیں، جب کہ اسلامی پروگرام ایک تو صرف ہفتے میں چند دن ہوتے ہیں۔ دوسرے ان پر آنے والے موضوعات عوام کے عملی مسائل سے دُور ہوتے ہیں۔ ان میں علمیت سے زیادہ لفاظی ہوتی ہے۔

جواب:- آپ پاکستانی ٹیلی وژن کے متعلق جس درد و کرب میں مبتلا ہیں، اس کے ستم رسیدگان

یہاں صد ہزار ملیں گے۔ مجھ سے زبانی گفتگو کرنے والے بہت سے اصحاب بھی اس قصۂ غم کو چھیڑتے ہیں۔ اخبار بھی دینی عناصر (خصوصاً نوجوانوں) کی اشک شوئی کے لیے ہفتے میں ایک آدھ خط اس سلسلے میں کاٹ چھانٹ کے شائع کر دیتے ہیں۔ رسائل اور تقاریر میں بھی یہ دکھڑا بہت رویا جاتا ہے، مگر یہ نئے دور کی ہماری بے مثال جمہوریت ہے کہ قوم کے جن کروڑوں افراد کے پیسے سے یہ سارا کھیل چل رہا ہے، اس کی ایک تعداد کثیر کے احساسات کی کوئی پروا نہ کی جائے اور ٹیلی وژن کے مخالفِ دین پروگرام ان کے سروں پر سے سڑک کوٹنے والے انجن کی طرف گذارے جاتے رہیں۔

عزیزِ من! آپ کو پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ یہاں واقعی کوئی ایسی اسلامی ریاست قائم ہے، جو عملاً معاشرے کو بنانے سنوارنے کی بہترین اسکیموں میں محو ہے اور وہ ساری توانائی صرف کر کے لوگوں کے ایمان واخلاق کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ اُن کو اقتصادی ضمانت کی اسلامی اسکیم کے سایۂ رحمت میں لانا چاہتی ہے۔ گو اس کا پیمان تحریکِ پاکستان کے مسلم لیگی قائدین نے قوم سے اور قوم کے بچے بچے نے اور ساری دُنیا کے سامنے خدا سے استوار کیا تھا۔ نیز قرارداد مقاصد کے ذریعے اسی پیمان کو دستوری حیثیت بھی دے دی گئی ــــ مگر بدقسمتی سے حالات کی دگرگونی نے ہمیں برسوں سے ایسی قوتوں کے شکنجے میں کس دیا ہے، جنہوں نے اس پیمان سے رُوگردانی اور فرار کی راہیں اختیار کیں۔ اور محض اسلام کا نام لے لے کر، یا اس نام کے ساتھ نہایت کچے اور بے ڈھنگے جزوی کام کر کر کے اپنے عوام کو اسلام سے اور زیادہ دُور کر دیا۔ زندگی کے ہر شعبے اور دائرے میں اسلام کو اتنے تضادات کے درمیان گھیر دیا گیا ہے۔ اور اب اس نازیبا طرزِ عمل کا کلائمکس یہ ہے کہ آپ کے وزیراعظم دنیا کے سامنے عالمی طاقتوں کو یقین دہانی کراتے ہیں کہ کوئی شریعت بل وغیرہ پاس نہیں ہوگا۔ مسلم لیگ کو مبارک باد!

آپ کو دوسری غلط فہمی ٹیلی وژن کے ادارۂ ابلاغ کے متعلق ہے۔ حاشا وکلا، ٹی وی کی تنصیب اس مُلک میں اسلام کے فروغ کے لیے نہیں ہوئی بلکہ مقصد برعکس ہے۔ ٹیلی وژن کے پروگرام اور اس کے کارکن اور کارپرداز جو شہادت ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے:

۱- پاکستانی قوم پر مغرب کی ملحدانہ تہذیب اور مادہ پرستانہ معاشرت کو غالب کرنا۔

۲- عورت کو دینداری اور پردے کے مخالف محاذ پر لا کر ایک طرف اسے سامانِ تفریح بنانا،

دوسری طرف اس کے ذریعے قوم کے گھر گھر میں ایک طرح کی کھینچا تانی پیدا کرنا، اور تیسری طرف اس طرح کی ماڈرن، اداکار، گلوکار، فن کار، ثقافت پرست اور فنونِ لطیفہ کی فریفتہ عورت کو سیکولرازم کی آلۂ کار بنا کر اُبھرتے ہوئے اسلامی رجحانات سے لڑانا۔

۳- شروع سے لادینیت پسند فن کاروں اور دانش وروں کے تسلط میں آتے ہوئے ٹیلی وژن کے ادارے میں مخالفِ اسلام عناصر کی عیاشانہ حد تک پرورش کا سامان کرنا۔

اِن کارناموں کے ساتھ ٹیلی وژن نے گھروں میں نئی پود کی کمان پوری طرح سنبھال لی ہے۔ پُرانے لوگ تو پھر بھی کچھ ایمانیات اور اخلاقیات اور رسم و رواج پر جمے چلے آرہے تھے۔ لیکن نئی پود جس میں پہلی صف نوجوانوں کی ہے، دوسری صف دس بارہ سال کے بچوں کی ہے اور تیسری صف ماں کی آغوش میں پلنے والے اور نرسری اسکولوں میں جانے والے بچے شامل ہیں، ان سب کا مائی باپ اور حقیقی معلم اور ماسٹر ٹیلی وژن ہے۔ وہ ایک خاص زبان ان کو سکھا رہا ہے، خاص قسم کے لباسوں اور آرائشوں کا فریفتہ بنا رہا ہے۔ خاص بیانوں اور قدروں اور معیارات کے بندھنوں میں جکڑ رہا ہے۔ اہم ترین دینی حقائق کو کہانیوں اور مزاحیہ پروگراموں میں کہیں تو مسخ کر رہا ہے اور کہیں ان کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر رہا ہے، اور کہیں ایک عمومی انتشارِ ذہنی کے بگولے اُٹھا رہا ہے۔ اسلام سے ٹکراتے ہوئے مغربی فلسفوں کے لیے ذہنوں کو اس طرح ہموار کر رہا ہے، گویا ان فلسفوں کی کوئی ملک گیر کمیشن ایجنسی ہمارے ہاں کھل گئی ہے۔

اب رہا نظریوں کے اُس کرتب اور تماشے کا مسئلہ جو تھوڑا سا اسلام کے نام پر ہو رہا ہے۔ یہ اسی طرح قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش ہے۔ جیسی سیاست تعلیم اور صحافت اور معیشت و مالیات وغیرہ اداروں میں ہو رہی ہے اور پہلے بھی ہوتی رہی ہے۔ اسلامی رجحانات تو کیا خود پاکستان کی حقیقی محبت پیدا کرنے والے کسی پروگرام کو بھی ٹیلی وژن کا نازک سکرین سہار نہیں سکتا۔ مولانا بلیغ الدین کا ذہنی سکہ چلنے لگا تو انہیں رخصت کر دیا گیا۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے درس نے عوام میں اثر بڑھایا تو انہیں چلتا کیا گیا۔ سلیم احمد مرحوم کا ایک ڈرامہ تعبیر اور نسیم حجازی کے ایک ناول کی ڈرامائی ہیئت نے پبلک میں نئی لہریں پیدا کر دیں تو ان سلسلوں کو وہیں روک دیا گیا۔ پھر اس طرح کی دوسری کوئی چیز کبھی نہ آسکی۔ ٹیلی وژن والوں کے مقالہ نگار، تنقید نگار، گیت

لکھنے والے اور نعتیں اور غزلیں سنانے والے شاعر، مذاکروں میں شریک ہونے والے دانشور، انٹرویوز میں نمایاں ہونے والے سرکاری افراد کے متوازی غیر سرکاری اہل زبان یا اہل قلم سب ایک خاص طرز کے ہیں۔ ان ساری افواج میں یا تو لادینیت پسندوں کی بھرتی ہوگی یا مسلم دشمن عناصر کی۔ یا دین اور لادینیت میں غیر جانب داروں کی، یا بے جان خیالی اسلامیت رکھنے والوں کی۔

کیا مجال کہ کوئی ایسا شخص کسی چھوٹے سے دائرے میں بھی راہ پا جائے، جس کی گفتگو یا شاعری یا کسی پروگرام سے قوم میں اسلامیت کی اُٹھتی لہر نمودار ہو سکتی ہو۔ یہاں صرف "عرفانی اسلام" کی کھپت ہے جس سے دنیا کی سپر پاورز اور ان کی حامی بڑی بڑی قوتیں مطمئن اور راضی رہیں۔

بلکہ اصل ہدف یہ ہے کہ اسلامی تحریکیت کی لہریں کچھ دیر اُوپر اُوپر حرکت کرتی رہیں اور اُن کے نیچے کے سمندر کو بحر منجمد شمالی میں بدل دیا جائے۔ یہاں تک کہ پھر کوئی لہر کبھی اُٹھ ہی نہ سکے۔

اِن حالات کی وجہ سے اس معاشرے کے بہت سے لوگوں نے یہ چاہتے ہوئے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جس حد تک ممکن ہو، ٹیلی وژن کے مفسدات سے بچا سکیں، اس محرومی کو قبول کر لیا ہے کہ وہ بعض مفید معلوماتی پروگراموں سے استفادہ نہ کر سکیں۔ لیکن ٹیلی وژن نہ خریدیں۔ یہ ایک طرح کا بے ضرر اور خاموش احتجاج ہے۔ جتنے بھی لوگ اِس احتجاج کو جاری رکھ سکیں، انھیں جاری رکھنا چاہیے تاکہ تبدیلی کے لیے ایک رَو معاشرے میں موجود رہے۔

یہ حال ایک ٹیلی وژن ہی کا نہیں۔ سرکاری اور نیم سرکاری اور غیر سرکاری دائروں میں مختلف اطراف سے اسلام کے خلاف سیلابی تموّج جاری ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نہ صرف یہ کہ گندگی کے ایک سمندر میں ڈال دیے گئے ہیں بلکہ اس سمندر کے چار طرف کناروں کے ساتھ ساتھ آہنی فصیلیں بنا دی گئی ہیں۔ اور خاردار جنگلے لگا دیے گئے ہیں۔ راہ نجات دو ہی صورتوں میں ہے۔ ایک یہ کہ اس سمندر کو گندگی سے پاک کیا جا سکے، دوسری یہ کہ اس سے باہر نکل کر صاف زمین پر ایک دنیا بنائی جا سکے۔ گندگی کے سمندر سے باہر نکل کر نئی دنیا بنانا ہی اصل حل ہے۔ مگر یہ حل بلائے عام کی بڑی قوت چاہتا ہے۔ یعنی جب تک گندگی کے سمندر میں ڈبکیاں کھانے والی قوم کے کثیر التعداد افراد دل سے گندگی سے نفرت نہ کرنے لگیں۔ اور کناروں پہ لگے جنگلوں اور فصیلوں سے نجات پانے کے لیے ایک پُر اضطراب آرزو اپنے اندر پیدا نہ کر لیں۔ اُس وقت تک آپ کو ٹیلی وژن کی

عنایات کو بھی سہنا ہوگا ۔ اخبارات کی کرم فرمائیوں کا بھی شرمندۂ احسان رہنا ہوگا، اور تعلیم اور معاش اور بیہودہ کریسی کے بگاڑ سے پیدا ہونے والی اذیتوں کو بھی بھگتنا ہوگا پس ٹیلیویژن والوں کے خلاف احتجاجی مراسلوں اور خطوط کے لکھنے سے اور دل ہی دل میں کڑھنے سے کچھ آگے بھی سوچئے ۔ ٹیلیویژن کی تبدیلی معاشرے کے تمام بڑے بڑے اداروں کی تبدیلی کے ساتھ ہی ممکن ہے ۔

پھر کیا آپ یہ عزم کرتے ہیں کہ آپ ہر روز کئی کئی افراد تک خدا پرستی، اخلاقی انقلاب اور احیائے اسلام کا پیغام اس طرح پہنچائیں گے جس طرح بیمار بچے کے والدین اس کی جان بچانے کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں یہاں تک کہ آپ ایک سال کے بعد سو پچاس نہیں تو کم از کم دس ہم خیال آدمی اپنے ساتھ کھڑے کر کے اپنی آواز کو مضبوط و مؤثر بنائیں ؟ اور آپ جیسے ۵۰ لاکھ افراد اگر اس طرح تبدیلی احوال کے لئے سخت محنت کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ٹیلی ویژن یا کوئی اور ادارہ رائے عامہ کے واضح رجحانات و مطالبات کے خلاف کسی غلط رخ پہ چل سکے ۔

مقامِ غم

محمد عثمان شمس ناظم شعبۂ خدمتِ خلق جماعتِ اسلامی لاہور
مینجنگ ڈائریکٹر پین اسلامک پبلشرز لاہور
کی والدہ ماجدہ کا مورخہ ۳ جولائی ۱۹۸۷ء بروز جمعہ کو اچانک انتقال ہوگیا ہے ۔
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے ۔ آمین

تمام احباب سے دعا کی درخواست ہے ۔

مطبوعات

ننھی منی خوبصورت نظمیں | نتیجۂ کاوش: حفیظ الرحمٰن احسن - ناشر: ایوانِ ادب، چوک اُردو بازار لاہور ۲ - خوبصورت رنگین طباعت و ڈیزائننگ - قیمت: -/۹ روپے

بڑوں کے لیے واعظ، ادیب، شاعر سب بہت - بچوں بیچاروں کے لیے نصیحتیں تو ہوں گی مگر اور کچھ نہیں - خصوصاً بچوں کے لیے جو لٹریچر ملتا ہے، اس میں بہت کم معیاری ہوتا ہے - پھر جب بات اسلام کی بھی آجائے تو بیچارے بچوں کو یونہی ٹرخایا جاتا ہے - بچوں کے لیے اسلامی نظموں کا تصور بھی عجیب، یعنی صرف ایسی شاعری کہ خدا نے یہ کہا اور رسولؐ نے یہ، اور نماز پڑھا کرو اور بس - نہ انسانی کرداروں سے واسطہ، نہ فطرت کی وسیع تماشا گاہ کے رنگ برنگ پھولوں سے اور جنگلی جانوروں اور پرندوں سے کوئی معرفت، نہ کھیلوں میلوں کی کوئی بات، نہ ہنسی مذاق اور لطیفوں کا سلسلہ، نہ جسم کے رکھ رکھاؤ کی تعلیم، نہ راستی و انصاف اور ناراستی و ظلم کی جھلکیاں، نہ نئی نئی ایجادات کے قصے، نہ اُن میں روشنی و خوشبو پھیلانے کے رجحانات اُبھارنے کی سعی -

اور اسلامی نظموں اور کہانیوں کے مجموعے بھی ایسے کہ نہ کہیں کوئی ڈیزائننگ، نہ رنگ کا استعمال، نہ خوبصورتی کا اہتمام، نتیجہ یہ کہ بچے پڑھتے ہیں تو "ٹوٹے بٹوٹ" جیسی نظمیں یا "اڑنے والی جل پری کا قصہ" یا "ٹارزن کا مصنوعی سیاروں پر حملہ" -

اس ساری افسوس ناک صورتِ حالات کی تلافی کے طور پر پہلی بار ایک جاندار رنگین اور دلچسپ مجموعہ نظموں کا ہمارے سامنے آیا ہے اور یہ کارنامہ ہے جناب حفیظ الرحمٰن احسن صاحب کا، جو بڑوں کو تعلیم دیتے دیتے بچوں کے ساتھ کھیلتے نکل کھڑے ہوئے -

اس مجموعے میں حمد اور دین کی باتیں بھی ہیں - کھلونوں اور تفریحات کے مشغلے بھی اور فطرت

کے الیموں کے اوراق کی سیر بھی - ہر صفحے پر ڈیزائنر نے کئی کئی رنگ جمع کر دیئے ہیں - بچے کی دلچسپی کی اشیاء کے ڈیزائن بھی ـــ بار بار بے اختیار واہ واہ کہنے کو جی چاہتا ہے -

صحیح راستے پر اس پہلے "سبز قدم" کے بعد ہم اُمید کرتے ہیں کہ اور بھی ارباب ذوق اقدام کریں گے - معیار مطلوب یہ ہے کہ کسی بھی عمر کا بچہ جس بھی موضوع پر جس بھی ٹیسٹ کی کوئی چیز ڈھونڈنا چاہے (یا اس کے سرپرست) تو انتخاب بلکہ ترجیح کا ہاتھ صرف پاکیزہ اور تعمیر پسندانہ لٹریچر ہی کی طرف بڑھے -

بغیر کسی ناقدانہ تجزیہ کے، بربنائے مسرت ہم نے محض یہ تعارفی سطور لکھ دی ہیں - مصنف، ناشر، قارئین، خصوصاً بچوں کو بہت بہت مبارک ہو!

واضح رہے کہ یہ "حصہ اول" ہے، حصہ دوم بھی آسکتا ہے اور اس سے آگے بھی!

ترجمان الحدیث ـــ سیرت نمبر | مدیر اعلیٰ : مولانا احسان الٰہی ظہیر مرحوم -

مقام اشاعت : ۵ لوئر مال - لاہور قیمت فی پرچہ ۳/- روپے - سالانہ ۲۵/- روپے

علامہ احسان الٰہی ظہیر اور ان کے ساتھیوں پر سے جو موجِ خون گذری ہے، اس کی وجہ سے خاص طور سے میں نے "ترجمان الحدیث" کے "سیرت نمبر" کا مطالعہ کیا - اب بہت ہی مجمل الفاظ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے اداریے میں سیرت کے بارے میں علامہ صاحب نے بڑی عالمانہ حیثیت سے چند باتیں بیان کی ہیں - بقیہ مقالات جو مختلف اہلِ قلم حضرات کی طرف سے شامل ہیں، بہت مفید اور صحیح معلومات پر مشتمل ہیں - ان میں جابجا ضروری حوالے بھی آگئے ہیں -

---

حوا کی بیٹی | مؤلف : نصیر احمد خلیلی - ناشر حسن البناء اکیڈمی - گلی نمبر ۸ - علامہ اقبال کالونی - ڈھوک کھبا/ٹینچ بھاٹہ راولپنڈی - طبقہ نسواں کی مغرب زدگی پر اظہار خیال -